امام زین العابدین علیہ السلام

کی زندگی

(ایک تحقیقی مطالعہ)

مصنفہ

آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای مدظلہ العالی

عرض ناشر

اللہ تعالیٰ کی توفیق اور امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کی تائید سے وہ مبارک تاریخ آئی یعنی ۱۵؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۴ھ مطابق ۱۶؍ جولائی ۲۰۰۳ء (یوم ولادت باسعادت سید الساجدین حضرت امام علی زین العابدین علیہ الصلوٰۃ والسلام) کہ جس دن (تقریباً ایک سال پہلے سے معرض فعلیت میں آنے والا ادارہ) بصدارت قبلہ وکعبہ معین الشریعۃ مولانا سید کلب جواد نقوی صاحب امام جمعہ لکھنؤ، باضابطہ طور پر فعالیت سے ہمکنار ہوا۔ یعنی مؤسسہ نور ہدایت کا دفتر برصغیر کے عظیم مجدد ہندوستان کے پہلے مجتہد اور امام جمعہ آیۃ اللہ العظمیٰ بحر العلوم مصلح اعظم مولانا سید دلدار علی نقوی نصیر آبادی نور اللہ مرقدہٗ کے عزاخانے الموسوم بہ ''حسینیہ غفران مآبؒ'' میں قائم ہوا جسکے زیر انتظام عربی وفارسی، حفظ وتجوید اور تاریخ ودینیات کے طلبہ کیلئے مدرسۂ نور ہدایت، دوسرے برائے اشاعتِ کتبِ مفیدہ مکتبۂ عماد الاسلام اور تیسرے تبلیغِ اسلام ونشر علوم محمدؐ وآل محمد علیہم الصلوٰۃ السلام کے واسطے شعبۂ تصنیف وتالیف کا قیام عمل میں آیا۔ ساتھ ہی آقائے شریعت صفوۃ العلماء مولانا سید کلب عابد نقوی (امام جمعہ لکھنؤ) طاب ثراہ کے نام نامی سے منسوب ''رحمت مآب دار المطالعہ'' اور ذاکر شام غریباں عمدۃ العلماء مولانا سید کلب حسین نقوی مجتہد (امام جمعہ لکھنؤ) اعلی اللہ درجتہٗ سے منسوب ''کتب خانۂ عمدۃ العلماء''

کانظام بھی اب موٴسسہٴ مذکور ہی کی نگرانی میں چل رہا ہے۔

شعبہٴ تصنیف وتالیف کا اس سال پانچواں ''خاندان اجتہاد نمبر'' اردو میں
اور ہندی میں پہلا ''خاندان اجتہاد نمبر'' طباعت کی منزل میں ہے۔اور مکتبہٴ عماد
الاسلام کی پہلی خدمت ولی امر مسلمین مرجع عالیقدر جہان تشیع رہبر انقلاب اسلامی
آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای متع اللہ المسلمین بطول حیاتہ کی تصنیف منیف کی
اشاعت ہے۔

کتاب مستطاب کا ترجمہ مولانا ولی حسن رضوی صاحب نے
''امام زین العابدینؑ'' کی زندگی (ایک تحقیقی مطالعہ) کے نام سے کیا ہے جو مجلّہ توحید
اردو میں شائع ہوا ہے جسے ۱۹۹۱ء میں اتحادیہ انجمن ہائے اسلامی دانشجویان ایرانی
ہند نے کتابی صورت میں زیور طباعت سے آراستہ کیا۔مضون کی اہمیت اور ضرورت کو
ملحوظ رکھتے ہوئے موٴسسہٴ نور ہدایت کا شعبہٴ تصنیف وتالیف بشکریہٴ ''مجلّہٴ توحید''
اس امید پر کتاب کو شائع کر رہا ہے کہ زیادہ سے زیادہ موٴمنین کرام مستفید ہو کر سماج
اور معاشرہ میں نظری وعملی انقلاب کی سعی بلیغ کریں گے۔

فقیر باب مدینۃ العلم

سید مصطفےٰ حسین نقوی اسیف جائسی

۲۷ رجب المرجب ۱۴۲۴ھ مطابق ۲۵ ستمبر ۲۰۰۳ء

امام زین العابدین علیہ السلام کی ذات اقدس کو موضوع سخن قرا
ور آپ کی سیرت طیبہ پر قلم اٹھانا نہایت ہی دشوار امر ہے اس کی وجہ یہ
اس عظیم امام کی معرفت و آشنائی سے متعلق مآخذ و مصادر بہت ہی
ر ناساعد ہیں

اکثر محققوں اور سیرت نگاروں کے ذہن میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے
ظیم ہستی محض ایک گوشہ نشین عابد و زاہد جیسی زندگی گذارتی رہی جس
یاست میں ذرّہ برابر دلچسپی اور دخل نہ تھا۔ بعض تاریخ نویسوں اور
ردوں نے تو اس چیز کو بڑی صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے اور وہ
وں نے صاف صاف وضاحت کے ساتھ یہ بات نہیں کہی انہوں نے
م علیہ السلام کی زندگی سے جو نتائج اخذ کئے ہیں اس سے مختلف نہیں
چہ حضرتؑ کے سلسلہ میں استعمال کی جانے والی تعبیرات سے یہ با

بہ آسانی درک کی جاسکتی ہے۔

بعض لوگوں نے اس عظیم ہستی کو 'بیمار' کے لقب سے یاد کیا ہے جبکہ آپ کی بیماری واقعۂ عاشورہ کے ان ہی چند دنوں تک محدود تھی اس کے بعد اس کا سلسلہ باقی نہ رہا، تقریباً سبھی لوگ اپنی عمر کے ایک حصہ میں بیمار پڑ ہی جاتے ہیں، اگرچہ امام زین العابدین علیہ السلام کی اس بیماری میں الٰہی حکمت و مصلحت بھی کار فرما تھی دراصل پروردگار عالم کو ان دنوں خدا کی راہ میں جہاد و دفاع کی ذمّہ داری، آپ پر سے اٹھا لینا مقصود تھا تاکہ آئندہ (شہادت امام حسینؑ کے بعد) امانت و امامت کا عظیم بار اپنے کاندھوں پر لے سکیں اور اپنے پدر بزرگوار کے بعد چونتیس یا پینتیس برس تک زندہ رہ کر نہایت ہی سخت اور پر آشوب دور طے کر سکیں۔

اگر آپ امام زین العابدینؑ کی سوانح حیات کا مطالعہ کریں تو ہمارے دیگر ائمہ کی طرح یہاں بھی ایک سے ایک نئے نئے قابلِ توجہ حادثات کا ایک سلسلہ نظر آئے گا لیکن، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آپ ان تمام واقعات کو اگر یکجا کر بھی لیں تب بھی امام علیہ السلام کی سیرت طیبہ کا سمجھ لینا آپ کے لئے آسان نہ ہوگا۔

کسی کی سیرت کو صحیح معنوں سمجھنا یا سمجھانا اسی وقت ممکن ہے جب اس شخصیت کے اصول اور بنیادی موقف کو اچھی طرح درک کر لیا

جائے اور پھر اس کی روشنی میں اس کی جزئیات زندگی سمجھنے کی کوشش کی جائے
اصل میں جب بنیادی موقف کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ جزئیات بھی بے زبان
نہیں رہتے خود بخود معنی پیدا کر لیتے ہیں۔ اس کے برخلاف اگر اصولی موقف
ہم پر واضح نہیں ہو سکے ہیں یا کچھ کا کچھ سمجھ بیٹھے ہیں تو جزئی واقعات
بھی یا تو بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں یا پھر ان کو غلط معنی پہنانے کی کوشش
کرنے لگتے ہیں اور یہ صرف امام زین العابدین علیہ السلام یا ہمارے دیگر ائمہ
طاہرینؑ سے مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ اصول ہر شخص کی زندگی کے تجزیہ کے
وقت پیش آ سکتا ہے۔

امام سجادؑ کے سلسلہ میں نمونہ کے طور پر، محمد بن شہاب زہری کے نام
حضرتؑ کا خط پیش کیا جا سکتا ہے جو آپ کی زندگی کا ایک حادثہ ہے یہ وہ خط ہے
جو خاندان نبوت و رسالت کی ایک عظیم فرد کی طرف سے اس دور کے مشہور
و معروف دانشور کو لکھا گیا ہے اب اس سلسلہ میں مختلف انداز سے اظہار رائے
کی گنجائش ہے ممکن ہے یہ خط کسی اساسی نوعیت کے حامل وسیع
سیاسی مبارزہ کا ایک حصہ ہو اور یہ بھی ممکن ہے برے کاموں سے روکنے
کی ایک سیدھی سادی نصیحت یا محض ایک شخصیت کا دوسری شخصیت
پر کیا جانے والا اسی قسم کا ایک اعتراض ہو جس قسم کے اعتراضات دو
شخصیتوں یا کئی شخصیتوں کے مابین تاریخ میں کثرت سے نظر آتے ہیں۔

ظاہر ہے دیگر حادثات و واقعات سے چشم پوشی کر کے صرف اس واقعہ سے کسی صحیح نتیجہ تک کبھی بھی نہیں پہنچا جا سکتا۔ میں اس نکتہ پر زور دینا چاہتا ہوں کہ اگر ہم ان جزئی واقعات کو امامؑ کے اصولی و بنیادی موقف سے علیحدہ کر کے مطالعہ کرنا چاہیں تو امام سجادؑ کی سوانح زندگی ہم پر روشن نہیں ہو سکتی لہٰذا ہمارے لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے ہم امامؑ کے اصولی اور اساسی موقف سے آگاہی حاصل کریں۔

چنانچہ ہماری سب سے پہلی بحث امام زین العابدین علیہ السلام کے بنیادی موقف سے متعلق ہے اور اس کے لئے خود امام علیہ السلام کی زندگی آپ کے کلمات نیز دیگر ائمہ طاہرین کی پاکیزہ سیرت و زندگی سے خوشہ چینی کرتے ہوئے بڑی ہی باریک بینی کے ساتھ نکات درک کر کے بحث کرنا ہوگی۔

حادثات زندگی میں ائمہؑ کا بنیادی موقف

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں سنہ ہجری میں امام حسن علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صلح کے بعد سے کبھی پیغمبر اسلامؐ کے اہلبیت اس بات پر راضی نہ ہوئے کہ فقط گھر میں بیٹھے اپنے ادراک کے مطابق احکامات الٰہیہ کی تشریح و تفسیر کرتے رہیں بلکہ صلح کے آغاز ہی سے تمام ائمہ طاہرینؑ کا بنیادی موقف اور منصوبہ یہ رہا ہے کہ وہ اپنے طرز فکر کے مطابق حکومت اسلامی کے لئے راہیں ہموار کریں چنانچہ یہ فکر خود امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی زندگی اور کلام میں

بطور احسن ملاحظہ کی جا سکتی ہے ۔

امام حسنؑ نے معاویہ سے صلح کرلی تو بہت سے ناعاقبت اندیش کم فہم افراد نے حضرتؑ کو مختلف عنوان سے ہدف بنا لیا اور اس سلسلہ میں آپ کو مورد الزام قرار دینے کی کوشش کی گئی کبھی تو آپ کو مومنین کی ذلت و رسوائی کا باعث گردانا گیا اور کبھی یہ کہا گیا کہ " آپنے معاویہ کے مقابلے پر آمادہ جوش و خروش سے معمور مومنین کی جماعت کو ذلیل و خوار کر دیا معاویہ کے سامنے ان کا سر جھک گیا " بعض اوقات احترام ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ذرا نرم و شائستہ انداز میں بھی یہی بات دہرائی گئی ۔

امام علیہ السلام ان تمام اعتراضوں اور زبان درازیوں کے جواب میں انھیں مخاطب کرکے ایک ایسا جامع و مانع جملہ ارشاد فرماتے تھے جو شاید حضرت کے کلام میں سب سے زیادہ فصیح و بلیغ اور بہتر ہو ۔ آپ کہا کرتے تھے کہ

" ماتدری لعلہ فتنۃ لکم ومتاع الیٰ حین "

تمہیں کیا خبر ، شاید یہ تمہارے لئے ایک آزمائش اور معاویہ کے لئے ایک عارضی سرمایہ ہو ۔ اصل میں یہ جملہ قرآن کریم سے اقتباس کیا گیا ہے ۔

اس جملہ سے صاف پتہ چلتا ہے کہ حضرت کو مستقبل کا انتظار رہے اور وہ مستقبل اس کے علاوہ کچھ اور نہیں ہو سکتا کہ امام علیہ السلام کے

نظریہ کے مطابق حق سے منحرف موجودہ ناقابل قبول حکومت برطرف کی جائے اور اس کی جگہ آپ کی پسندیدہ حکومت قائم کی جائے جبھی تو آپؑ ان لوگوں سے فرماتے ہیں کہ تم فلسفۂ صلح سے واقفیت نہیں رکھتے تمہیں کیا معلوم کہ اسی میں مصلحت مضمر ہے۔

آغاز صلح میں ہی عمائدین شیعہ میں سے دو شخصیتیں، مسیب بن نجیہ اور سلیمان بن صرد خزاعی چند مسلمانوں کے ہمراہ امام حسن مجتبیٰؑ کی خدمت میں شرفیاب ہوئیں اور عرض کیا: ہمارے پاس خراسان وعراق وغیرہ کی خاصی طاقت موجود ہے اور ہم اسے آپ کے اختیار میں دینے کے لئے تیار ہیں اور معاویہ کا شام تک تعاقب کرنے کے لئے حاضر ہیں۔

حضرتؑ نے ان کو تنہائی میں گفتگو کرنے کے لئے طلب کیا اور کچھ بات چیت کی، جب وہ وہاں سے باہر نکلے تو ان کے چہرے پر طمانیت کے آثار ہویدا تھے۔ انھوں نے اپنے فوجی دستوں کو رخصت کر دیا حتیٰ کہ ساتھ آنے والوں کو بھی کوئی واضح جواب نہ دیا۔

طٰہٰ حسین کا خیال ہے کہ "دراصل اسی ملاقات میں شیعوں کی تحریک جہاد کا سنگ بنیاد رکھ دیا گیا تھا۔" یعنی وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ امام حسن مجتبیٰؑ، ان کے ساتھ تنہائی میں بیٹھے، مشورے ہوئے اور اسی وقت شیعوں کی ایک عظیم تنظیم کی بنیاد رکھ دی گئی۔

چنانچہ خود امام کے حالات زندگی اور مقدس ارشادات سے بھی واضح طور پر یہی مفہوم نکلتا ہے۔ اگرچہ یہ زمانہ اس قسم کی تحریک اور سیاسی جدوجہد کے لئے سازگار نہ تھا۔ لوگوں میں سیاسی شعور بے حد کم اور دشمن کے پروپیگنڈوں نیز مالی داد و دہش کا بازار گرم تھا۔ دشمن جن طریقوں سے فائدہ اٹھا رہا تھا، امامؑ اختیار نہیں کر سکتے تھے۔ مثال کے طور پر بے حساب پیسہ خرچ کرنا اور معاشرہ کے چھٹے ہوئے بدقماش افراد کو اپنے گرد اکٹھا کر لینا امام علیہ السلام کے لئے ممکن نہ تھا۔ ظاہر ہے دشمن کا ہاتھ کھلا ہوا تھا اور امام کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ آپ اخلاق و شریعت کے خلاف کوئی کام انجام نہ دے سکے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ امام حسن علیہ الصلوٰۃ والسلام کا کام نہایت ہی عمیق، دیرپا اور بنیادی قسم کا تھا۔ دس برس تک حضرتؑ اسی ماحول میں زندگی بسر کرتے رہے۔ لوگوں کو اپنے قریب کیا اور انھیں تربیت دی۔ کچھ لوگوں نے مختلف گوشہ و کنار میں جام شہادت نوش کر کے معاویہ کی حکومت سے کھل کر مقابلہ کیا اور نتیجہ کے طور پر اس کی مشنری کو کافی کمزور بنایا۔

اس کے بعد امام حسین علیہ السلام کا زمانہ آیا تو آپ نے بھی اسی روش پر کام کرتے ہوئے مدینہ، مکہ نیز دیگر مقامات پر اس تحریک کو آگے بڑھایا۔ یہاں تک کہ معاویہ دنیا سے رخصت ہوا اور کربلا کا حادثہ رونما ہوا۔ اگرچہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کربلا کا حادثہ اسلام کے

مستقبل کے لئے نہایت ہی مفید اور ثمر آور ثابت ہوا لیکن وقتی طور پر، وہ مقصد جس کے لیۓ امام حسن اور امام حسین علیہما السلام کوشاں تھے کچھ دنوں کے لئے اس میں تاخیر ہو گئی کیونکہ اس حادثہ نے دنیائے اسلام کو رعب و وحشت میں مبتلا کر دیا۔ امام حسنؑ و امام حسینؑ کے قریبی رفقاء کو تہ تیغ کر دیا گیا اور دشمن کو تسلط و غلبہ حاصل ہو گیا۔ اگر اقدام امام حسینؑ اس شکل میں رونما نہ ہوتا اور یہ تحریک طبیعی طور پر جاری رہتی تو یہ بات بعید از امکان نہیں کہ مستقبل قریب میں جدوجہد کچھ ایسا رخ اختیار کر لیتی کہ حکومت کی باگ ڈور شیعوں کے ہاتھ میں آجاتی۔ البتہ یہاں اس گفتگو کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ (معاذ اللہ) امام حسینؑ کو انقلاب برپا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ بلکہ حالات نے کروٹ ہی کچھ ایسی بدلی تھی کہ حسینی انقلاب ناگزیر ہو گیا تھا، اس میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ اسلام کی بقا کیلئے حسینی انقلاب بے حد ضروری تھا لیکن اگر یکایک حالات یہ رخ اختیار نہ کر لئے ہوتے اور امام حسینؑ اس حادثہ میں شہید نہ ہوئے ہوتے تو شاید جلد ہی مستقبل سے متعلق امام حسن علیہ السلام کا منصوبہ بار آور ہو جاتا۔ چنانچہ یہاں میں ایک روایت نقل کر رہا ہوں جس سے اس بیان کی واضح تائید ہوتی ہے اصول کافی میں ابو حمزہ ثمالی کی ایک روایت امام محمد باقر علیہ السلام سے یوں نقل کی گئی ہے:

"سمعت اباجعفر علیہ السلام یقول: یاثابت،

ان اللہ تبارک و تعالیٰ قد کان وقّت ھٰذا الامر فی السبعین"

"ھٰذا الامر" سے مراد حکومت و ولایت اہلبیت ہے کیونکہ روایات میں اگر تمام مقامات پر نہ کہا جائے تو اکثر و بیشتر مقامات پر جہاں جہاں بھی 'ھٰذا الامر' کی تعبیر استعمال ہوئی ہے اس سے مقصود اہلبیت کی حکومت و ولایت ہی ہے اگرچہ بعض موارد میں یہ کلمہ 'تحریک اور اقدام' کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے اور وہاں حکومت مراد نہیں ہے۔ بہر حال 'ھٰذا الامر' یہ موضوع۔ کونسا موضوع؟ وہی جو شیعیان آل محمدؐ کے درمیان رائج و مرسوم رہا ہے اور جس کے بارے میں برسوں گفتگو ہوتی رہی ہے جس کی تکمیل کی آرزو اور منصوبہ سازی کی جاتی رہی ہے۔ امام محمد باقر علیہ السلام اس روایت میں فرماتے ہیں: "خداوند عالم اس امر (یعنی حکومت اہلبیت) کے لئے ۷۰ھ ہجری معین کر چکا تھا اور یہ شہادت امام حسینؑ کے دس سال بعد کی تاریخ ہے۔

امامؑ اس کے بعد فرماتے ہیں:

فلمّا ان قتل الحسین صلوات اللہ علیہ اشتد غضب اللہ تعالیٰ علیٰ اہل الارض فاخّرہ الی اربعین ومائۃ

جب امام حسین علیہ الصلوٰۃ والسلام کو شہید کر دیا گیا، اہل زمین پر

خداوند عالم کے غضب میں شدت پیدا ہوگئی اور وہ (تاسیس حکومت کا) کا وقت سنہ ۱۴۰ ہجری تک کے لئے آگے بڑھا دیا گیا۔

یہ تاریخ (سنہ ۱۴۰ ہجری) امام جعفر صادق علیہ السلام کی شہادت سے آٹھ سال قبل کی ہے چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام کی سوانح حیات کے ذیل میں ہم سنہ ۱۴۰ ہجری کی اہمیت کے بارہ میں تفصیلی بحث کریں گے اس سلسلے میں میرا خیال یہی ہے کہ وہ 'ولی امر' جس کے ذریعہ ایک انقلابی اقدام کے تحت اہلبیت کا حق واپس ملنا تھا امام جعفر صادق علیہ السلام کی ہی ذات مبارک ہونی چاہیئے تھی مگر اس وقت بنو عباس نے خود خواہی عجلت پسندی، دنیا پرستی اور ہوائے نفس کی پیروی کرتے ہوئے ہر جائز و ناجائز حربہ استعمال کیا اور یہ فرصت بھی اہلبیت کے ہاتھ سے چھین لی گئی اور وعدۂ الٰہی پھر کسی اور وقت کے لئے ٹل گیا۔

روایت کے آخری فقرے یہ ہیں:

نحدّثناکم فاضعتم الحدیث وکشفتم حجاب الستر (ایک دوسرے نسخہ میں قناع الستّر ہے) ولم یجعل اللّٰہ له بعد ذالك وقتاً عندنا، ویمحوا اللّٰہ مایشاء ویثبت وعندہ ام الکتاب۔

یعنی ہم تے تم لوگوں کو اس واقعہ سے مطلع کیا اور تم نے اس کو نشر کردیا بات پردۂ راز میں نہ رکھ سکے۔ عوام میں نہ کہا جانے والا راز افشا کردیا۔ لہٰذا اب

خداوند عالم نے اس امر کے لئے کوئی دوسرا وقت معین طور پر قرار نہیں دیا ہے، خداوند عالم اوقات کو محو کر دیا کرتا ہے جس چیز کی چاہتا ہے نفی کر دیتا ہے اور جس چیز کو چاہتا ہے ثابت کر دکھاتا ہے — اور یہ بات ناقابل تردید، مسلمات اسلام میں سے ہے کہ مستقبل کے سلسلہ میں جو بات خدا کی جانب سے حتمی قرار دی جاچکی ہے وہ لطف و قدرت الٰہی میں تفسیر پذیر نہیں ہے۔

ابوحمزۂ ثمالی کہتے ہیں:

حدثت بذالك اباعبد الله (ع) فقال: كان كذالك[1]

میں نے یہ روایت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں بیان کی جس کو سن کر امام نے فرمایا: ہاں واقعہ اسی طرح ہے۔

اس قسم کی روایتیں بہت ہیں لیکن مذکورہ روایت ان سب میں واضح اور روشن ہے۔

حکومت اسلامی کی تشکیل ائمہؑ کا بنیادی ہدف رہا ہے۔

اسلامی حکومت کی تشکیل تمام ائمہ کا مقصد و ہدف رہا ہے، وہ ہمیشہ اسی راہ پر گامزن رہے ہر ایک نے وقت اور حالات کے تحت اس راہ میں اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ چنانچہ جب کربلا کا حادثہ رونما ہوا اور سید الشہداء امام

---

[1] اصول کافی۔ کتاب الحجہ۔ باب کراھیۃ التوقیت۔ روایت اول ج ۲ ص ۱۹۰ طبع بنیاد رسالت۔ تہران

حسین علیہ الصلوٰۃ والسلام شہید کردیئے گئے نیز بیماری کی حالت میں ہی امام سجادؑ کو اسیر بنا لیا گیا تو حقیقتاً اسی وقت سے امام سجاد کی ذمہ داریوں کا آغاز ہو گیا۔

اب تک مستقبل (یعنی حکومت اسلامی کی تشکیل) کی جو ذمہ داری امام حسنؑ اور پھر امام حسینؑ کے کاندھوں پر تھی، وہ امر امام زین العابدین علیہ السلام کے سپرد کر دیا گیا اب آپ کی ذمہ داری تھی کہ اس مہم کو آگے بڑھائیں اور پھر آپ کے بعد دوسرے ائمہ طاہرین اپنے اپنے دور میں اس مہم کو پایۂ تکمیل تک پہونچائیں۔

لہٰذا ہمیں چاہیئے کہ جناب امام سجاد کی پوری زندگی کا اسی روشنی میں جائزہ لیں۔ اسی بنیادی مقصد اور اصلی موقف کو تلاش کریں۔ ہمیں بلا کسی شک وشبہ کے یہ بات ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ امام زین العابدین علیہ السلام بھی اسی الٰہی مقصد کی تکمیل میں کوشاں تھے جس کے لئے امام حسنؑ اور امام حسین علیہما السلام سعی وکوشش کر رہے تھے۔

امام سجاد کی زندگی کا ایک مجموعی خاکہ:

امام زین العابدین علیہ السلام نے سنہ ۶۱ ہجری میں عاشورہ کے دن امامت کی عظیم ذمہ داریاں اپنے کاندھوں پر سنبھالیں اور سنہ ۹۴ ہجری میں آپ کو زہر سے شہید کر دیا گیا۔ اس پورے عرصہ میں آپ علیہ السلام اسی مقصد کی تکمیل کیلئے کوشاں رہے اب آپ مذکورہ نقطۂ نگاہ کی روشنی میں حضرت کی جزئیات زندگی کا جائزہ لیجئے کہ آپ اس ذیل میں کن مراحل سے گزرتے رہے کیا طریقۂ کار اپنائے

اور پھر کس حد تک کامیابیاں حاصل ہوئیں۔

وہ تمام ارشادات جو آپ کے ذہن مبارک سے جاری ہوئے۔ وہ اعمال جو آپ نے انجام دیئے وہ دعائیں جو لب مبارک تک آئیں وہ مناجاتیں اور راز و نیاز کی باتیں جو آج صحیفۂ کاملہ کی شکل میں موجود ہیں ان سب کی امامؑ کے اسی بنیادی موقف کی روشنی میں تفسیر و تعبیر کی جانی چاہیئے چنانچہ اس پورے دور امامت میں مختلف موقعوں پر حضرتؑ کے موقف اور فیصلوں کو بھی اسی عنوان سے دیکھنا چاہیئے مثال کے طور پر ــــ

۱۔ اسیری کے دوران، کوفہ میں عبید اللہ ابن زیاد اور پھر شام میں یزید پلید کے مقابلہ میں آپ کا موقف جو شجاعت و فداکاری سے بھرا ہوا تھا۔

۲۔ مسرف بن عقبہ کے مقابلہ میں ــ جس کو یزید نے اپنی حکومت کے تیسرے سال مدینۂ رسولؐ کی تباہی اور اموال مسلمین کی غارت گری پر مامور کیا تھا ــ امام علیہ السلام کا موقف نہایت ہی نرم تھا۔

۳۔ عبد الملک بن مروان جس کو خلفائے بنو امیہ میں طاقتور ترین اور چالاک ترین خلیفہ شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں امامؑ کا موقف کبھی تو بہت ہی نرم نظر آتا ہے ــ

اسی طرح ــــ

۴۔ عمر بن عبد العزیز کے ساتھ آپ کا برتاؤ،

۵- اپنے اصحاب اور رفقاء کے ساتھ آپ کا سلوک اور دوستانہ نصیحتیں اور
۶- ظالم و جابر حکومت اور اس کے عملے سے وابستہ درباری علماء کے ساتھ امام علیہ السلام کا رویہ ؟

ان تمام موقفوں اور اقدامات کا بڑی باریک بینی کے ساتھ مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔ میں تو اسی نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ اگر اس بنیادی موقف کو پیش نظر رکھتے ہوئے تمام جزئیات و حوادث کا جائزہ لیا جائے تو بڑے ہی معنی خیز حقائق سامنے آئیں گے۔ چنانچہ اگر اس زاویہ سے امامؑ کی حیات طیبہ کا مطالعہ کریں تو یہ عظیم ہستی ایک ایسا انسان نظر آئے گی جو اس روئے زمین پر خداوند وحدہٗ لا شریک کی حکومت قائم کرنے اور اسلام کو اس کی اصل شکل میں نافذ کرنے کو ہی اپنا مقدس مقصد سمجھتے ہوئے اپنی تمام تر کوشش و کاوش بروئے کار لاتا رہا ہے اور جس نے پختہ ترین اور کارآمد ترین کارکردگی سے بہرہ مند ہو کر نہ صرف یہ کہ اسلامی قافلہ کو اس پراگندگی اور پریشاں حالی سے نجات دلائی ہے جو واقعۂ عاشور کے بعد دنیائے اسلام پر مسلط ہو چکی تھی بلکہ قابل دید حد تک اس کو آگے بھی بڑھایا ہے۔ دو اہم اور بنیادی فریضے جو ہمارے تمام ائمہ کو سونپے گئے تھے (ہم ابھی ان کی طرف اشارہ کریں گے) ان کو امام سجادؑ نے بڑی خوش اسلوبی سے جامۂ عمل پہنایا ہے۔ آپ پوری سیاسی بصیرت اور شجاعت و شہامت کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہایت ہی احتیاط اور باریک بینی سے اپنے

فرائض انجام دیتے رہے یہاں تک کہ تقریباً ۳۵ سال کی انتھک جدوجہد اور الٰہی نمائندگی کی عظیم ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے بعد آپ سرفراز و سربلند اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے اور اپنے بعد امامت و ولایت کا عظیم بار اپنے فرزند وجانشین امام محمد باقر علیہ السلام کے سپرد فرما دیئے۔

چنانچہ امام محمد باقر علیہ السلام کو منصب امامت اور حکومت اسلامی کی تشکیل کی ذمہ داریوں کا سونپا جانا روایات میں بڑے ہی واضح الفاظ کے ساتھ موجود ہے۔ ایک روایت کے مطابق امام زین العابدین علیہ السلام نے اپنے فرزندوں کو جمع کیا اور محمدؑ بن علیؑ یعنی امام محمد باقر علیہ السلام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:۔

"یہ صندوق اور یہ اسلحہ سنبھالو یہ تمہارے ہاتھوں میں امانت ہے۔"

اور جب صندوق کھولا گیا تو اس میں قرآن اور کتاب تھی۔

میرے خیال میں اسلحہ سے انقلابی قیادت اور رہبری کی طرف اشارہ' قرآن و کتاب، اسلامی افکار و نظریات کی علامت ہے اور یہ چیزیں امام نے اپنے بعد آنے والے امام کی تحویل میں دیکر نہایت ہی اطمینان و سکون کے ساتھ آگاہ و بیدار انسانوں اور خداوند عالم کی نظر میں سرفراز و سرخ رو اس دنیا کو خیرباد کہا ہے۔

یہ جناب امام سجادؑ کی حیات طیبہ کا ایک مجموعی خاکہ ہے اب اگر ہم تمام جزئیات زندگی کا تفصیلی جائزہ لینا چاہیں تو صورت حال کو پہلے سے مشخص

لینا چاہئے۔

حضرتؑ کی حیات مبارکہ میں ایک مختصر سا دور وہ بھی ہے جس کو شمارۂ زندگی
سے تعبیر کرنا غلط نہ ہوگا۔ میں چاہتا ہوں کہ سب سے پہلے اسی کا ذکر کروں اور پھر
م کی معمول کے تحت عادی زندگی، اس زمانے کے حالات و کوائف اور ان
کے تقاضوں کی تشریح کروں گا۔

دراصل امام کی زندگی کا وہ مختصر اور تاریخ ساز دور، معرکۂ کربلہ کے بعد آپ
اسیری کا زمانہ ہے جو مدّت کے اعتبار سے مختصر لیکن واقعات و حالات کے
تبار نہایت ہی ہیجان آور و سبق آموز ہے جہاں اسیری کے بعد بھی آپ
کا موقف بہت ہی سخت اور مزاحمت آمیز رہتا ہے۔ بیمار اور قید ہونے کے
ود کسی عظیم مرد مجاہد کے مانند اپنے قول و فعل کے ذریعہ شجاعت و دلیری کے
رین نمونے پیش کئے ہیں۔ اس دوران، امام کا طرز عمل حضرت کی بقیہ عام
گی سے — جیسا کہ آپ آئندہ ملاحظہ فرمائیں گے — بالکل مختلف نظر آتا ہے۔
م علیہ السلام کی زندگی کے اصلی دور میں آپ کی حکمت عملی مستحکم بنیاد پر
ے ہی تلے انداز میں نرم روی کے ساتھ اپنے مقصد کی طرف آگے بڑھتا ہے
ں کی بعض وقت عبدالملک بن مروان کے ساتھ نہ صرف ایک محفل میں بیٹھے
ئے نظر آئے ہیں بلکہ اس کے ساتھ آپ کا رویہ بھی نرم نظر آتا ہے، جبکہ اس
ر مدت (ایام اسیری) میں آپ کے اقدامات بالکل کسی پر جوش انقلابی

کے مانند نظر آتے ہیں جس کے لئے کوئی معمولی سی بات بھی برداشت کر لینا ممکن نہیں ہے لوگوں کے سامنے بلکہ بھرے مجمع میں بھی مغرور و باوقار دشمن کا دنداں شکن جواب دینے میں کسی طرح کا تامل نہیں کرتے۔

کوفہ کا درندہ صفت خونخوار حاکم، عبید اللہ ابن زیاد جس کی تلوار سے خون ٹپک رہا ہے جو فرزند رسولؐ امام حسینؑ اور ان کے اعوان و انصار کا خون بہا کر مست و مغرور اور کامیابی کے نشہ میں بالکل چور ہے اس کے مقابلہ میں حضرتؑ ایسا بے باک اور سخت لب ولہجہ اختیار کرتے ہیں کہ ابن زیاد آپ کے قتل کا حکم جاری کر دیتا ہے چنانچہ اگر جناب زینبؑ سلام اللہ علیہا ڈھال کے مانند آپ کے سامنے آکر یہ نہ کہیں کہ میں اپنے جیتے جی ایسا ہرگز نہ ہونے دونگی اور ایک عورت کے قتل کا مسئلہ درپیش نہ آتا نیز یہ کہ قیدی کے طور پر دربار شام میں حاضر کرنا مقصود نہ ہوتا تو عجب نہیں ابن زیاد امام زین العابدینؑ کے خون سے بھی اپنے ہاتھ رنگین کر لیتا۔

بازار کوفہ میں آپ اپنی پھوپھی جناب زینبؑ اور اپنی بہن جناب سکینہؑ کے ساتھ ہم صدا ہو کر تقریر کرتے ہیں لوگوں میں جوش و خروش پیدا کرتے ہیں اور حقیقتوں کا انکشاف کر دیتے ہیں۔

اسی طرح شام میں چاہے وہ یزید کا دربار ہو یا مسجد میں لوگوں کا بے پناہ ہجوم، بڑے ہی واضح الفاظ میں دشمن کی سازشوں سے پردہ اٹھا کر

حقائق کا برملا اظہار کرتے رہتے ہیں چنانچہ حضرت کے ان تمام خطبوں اور تقریروں میں اہلبیت کی حقانیت، خلافت کے سلسلے میں ان کا استحقاق اور موجودہ حکومت کے جرائم اور ظلم و زیادتی کا پردہ چاک کرتے ہوئے نہایت ہی تلخ و درشت لب و لہجہ میں غافل و ناآگاہ عوام کو جھنجھوڑنے اور بیدار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

یہاں ان خطبوں کو نقل کرکے امامؑ کے فقروں کی گہرائی پیش کرنے کی گنجائش نظر نہیں آتی کیونکہ یہ خود ایک مستقل کام ہے اور اگر کوئی شخص ان خطبوں کی تشریح و تفسیر کرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ ان بنیادی حقائق کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک ایک لفظ کی تحقیق اور چھان پھٹک کرے۔ یہ ہے امامؑ کی اسارت اور قید و بند کی زندگی جو جرأت و ہمت اور شجاعت و دلاوری سے معمور نظر آتی ہے۔

رہائی کے بعد!

ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کون سی وجوہات تھیں جن کے پیش نظر امام علیہ السلام کے موقف میں ایسی تبدیلی پیدا ہو گئی کہ اب قید سے چھوٹ کر آپ نہایت ہی نرم روی کا مظاہرہ کرنے لگتے ہیں۔ تقیہ سے کام لیتے ہیں۔ اپنے تیز و تند انقلابی اقدامات پر دعا اور نرم روی کا پردہ ڈال دیتے ہیں تمام امور بڑی خاموشی کے ساتھ انجام دیتے ہیں جبکہ قید و بند

کے عالم میں آپ نے ایسے دلیرانہ عزائم کا اظہار اور مخاصمت آمیز اقدام فرمایا ہے؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ایک استثنائی دور تھا یہاں جناب امام سجادؑ کو فرائض امامت کی ادائیگی اور حکومت الٰہی و اسلامی کی تشکیل کے لئے مواقع کی فراہمی کے ساتھ ہی ساتھ عاشورہ کو بہنے والے بے گناہوں کے خون کی ترجمانی بھی کرنی تھی ـــــ حقیقت تو یہ ہے کہ یہاں جناب امام سجادؑ کے ذہن میں ان کی اپنی زبان نہ تھی بلکہ شمشیر سے خاموش کر دی جانے والی حسینؑ کی زبان اس وقت کوفہ و شام کی منزلوں سے گزرنے والے اس انقلابی جوان کو ودیعت کر دی گئی تھی۔

چنانچہ اگر اس منزل میں امام زین العابدین علیہ السلام خاموش رہ جاتے اور اس جرأت و ہمت اور جواں مردی و بے باکی کے ساتھ حقائق کی وضاحت کر کے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی نہ کر دیئے ہوتے تو آئندہ آپ کے مقاصد کی تکمیل کی تمام راہیں مسدود ہو کر رہ جاتیں کیونکہ یہ امام حسینؑ کا جوش مارتا ہوا خون ہی تھا جس نے نہ صرف آپ کے لئے میدان ہموار کر دیا بلکہ تاریخ تشیع میں جتنی بھی انقلابی تحریکیں برپا ہوئی ہیں۔ ان سب میں خون حسینؑ کی گرمی شامل نظر آتی ہے چنانچہ امام زین العابدین علیہ السلام سب سے پہلے لوگوں کو موجودہ صورت حال سے خبردار کر دینا ضروری سمجھتے

ہیں تاکہ آئندہ اپنے اسی عمل کے پرتو میں بنیادی و اصولی، عمیق و متین طولانی مخالفتوں کا سلسلہ شروع کر سکیں اور ظاہر ہے تیز و تند زبان استعمال کئے بغیر لوگوں کو متنبہ اور ہوشیار کرنا ممکن نہ ہوتا۔

اس قید و بند کے سفر میں جناب امام سجاؔد علیہ السلام کا کردار جناب زینب سلام اللہ علیہا کے کردار سے بالکل ہم آہنگ ہے دونوں کا مقصد حسینی انقلاب اور پیغامات کی تبلیغ و اشاعت ہے اگر لوگ اس بات سے واقف ہو جائیں کہ حسینؑ قتل کر دیئے گئے، کیوں قتل کئے گئے؟ اور کس طرح قتل کئے گئے؟ تو آئندہ، اسلام اور اہلبیت علیہم السلام کی دعوت ایک نیا رنگ اختیار کرے گی لیکن اگر عوام ان حقیقتوں سے ناواقف رہ گئے تو انداز کچھ اور ہوگا۔

لہٰذا معاشرہ میں ان حقائق کو عام کر دینے اور صحیح طور پر حسینی انقلاب کو پہونچانے کے لئے اپنا تمام سرمایہ بروئے کار لاکر جہاں تک ممکن ہو سکے اس کام کو انجام دینا ضروری تھا۔ چنانچہ جناب امام سجاد علیہ السلام کا وجود بھی جناب سکینہؑ، جناب فاطمہ صغریٰؑ، خود جناب زینبؑ بلکہ ایک ایک قیدی کے مانند (اپنی اپنی صلاحیت کے اعتبار سے) اپنے اندر ایک پیغام لئے ہوئے ہے۔ ضروری تھا کہ یہ تمام انقلابی قوتیں مجتمع ہو کر غربت و بیکسی میں بہا دیئے جانے والے حسینیؑ خون کی سرخی کربلا سے لیکر مدینہ

تک تمام بڑے بڑے اسلامی مراکز میں پھیلادیں۔

جس وقت امام سجادؑ علیہ السلام مدینہ میں وارد ہوں لوگوں کی بےچین و متجس، سوالی نگاہوں، چہروں اور زبانوں کے جواب میں آپ ان کے سامنے حقائق بیان کریں۔ اور یہ امام کی آئندہ مہم کا نقش اوّل ہے ۔۔ اسی لئے ہم نے امام زین العابدین علیہ السلام کے اس مختصر دور حیات کو ایک استثنائی دور سے تعبیر کیا ہے۔

اس مہم کا دوسرا دور اس وقت شروع ہوتا ہے جب آپ مدینۂ رسولؐ میں ایک محترم شہری کی حیثیت سے اپنی زندگی کا آغاز کرتے ہیں اور اپنا کام پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر اور آپؐ کے حرم (مسجد النبیؐ) سے آغاز کرتے ہیں۔ جناب امام سجادؑ علیہ السلام کے آئندہ موقف اور طریقۂ کار کو سمجھنے کیلئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کی حالت و کیفیت اور اس کے تقاضوں پر بھی ایک تحقیقی نظر ڈال لی جائے۔

امام زین العابدین علیہ السلام نے اپنی تحریک کس طرح شروع کی، آپ کا مقصد اور طریقۂ کار کیا تھا ان تمام باتوں کو معلوم کرنے کیلئے ضروری ہے کہ اس وقت کی حکمران سیاسی مشینری سے بیزار و متنفر مخالفین کے مجموعی حالات اور بنی امیہ کے بارہ میں ان کے خیالات ساتھ ہی ساتھ طرفداران اہلبیت کی کلی صورتحال پر ایک نظر ڈال لی جائے اور یہ امام سجادؑ کی زندگی کا ایک مستقل

باب ہے چنانچہ اگر تفصیل کے ساتھ اس موضوع پر گفتگو ممکن ہوئی تو امام ؑ کی زندگی سے متعلق بہت سی مشکلات اور الجھنیں حل ہو جائیں گی۔ (البتہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ کس حد تک تفصیل میں جانا ہمارے لئے ممکن ہوگا)

ماحول :

جب عاشور کا المناک حادثہ رونما ہوا، پوری اسلامی دنیا میں جہاں جہاں بھی یہ خبر پہونچی خصوصاً عراق اور حجاز میں مقیم ائمہ علیہم السلام کے شیعوں اور طرفداروں میں ایک عجیب رعب و وحشت کی فضا پیدا ہوگئی کیونکہ یہ محسوس کیا جانے لگا کہ یزیدی حکومت اپنی حاکمیت کو مسلط کرنے کے لئے کچھ بھی کرسکتی ہے حتی کہ اس کو عالم اسلام کی جانی پہچانی عظیم، مقدس اور معتبر ترین ہستی فرزند رسول حسین ؑ ابن علی ؑ کو بے دردی کے ساتھ قتل کرنے میں بھی کسی طرح کا کوئی دریغ نہیں ہے ۔ اور اس رعب و وحشت میں جس کے آثار کوفہ و مدینہ میں کچھ زیادہ ہی نمایاں تھے، جو کچھ کمی رہ گئی تھی وہ بھی اسوقت پوری ہوگئی جب کچھ ہی عرصہ بعد بعض دوسرے لرزہ خیز حوادث رونما ہوئے جن میں سر فہرست حادثہ "حرہ" ہے۔

اہلبیت طاہرین کے زیر اثر علاقوں یعنی حجاز (خصوصاً مدینہ) اور عراق (خصوصاً کوفہ) میں بڑا ہی گھٹن کا ماحول پیدا ہوگیا تھا تعلقات وارتباطات کافی کمزور ہو چکے تھے ۔ وہ لوگ جو ائمہ طاہرین ؑ کے طرفدار تھے اور بنو امیہ

کی خلافت وحکومت کے زبردست مخالفین میں شمار ہوتے تھے بڑی ہی کسمپری اور شک وشبہ کی حالت میں زندگی بسر کر رہے تھے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک روایت منقول ہے کہ حضرت[1] گزشتہ ائمہ کے دور کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ارتد الناس بعد الحسین ع الا ثلاثة

یعنی امام حسین علیہ السلام کے بعد تین افراد کے علاوہ سارے لوگ مرتد ہوگئے، ایک روایت میں پانچ افراد اور بعض دوسری روایتوں میں سات افراد تک کا ذکر ملتا ہے۔

ایک روایت جو خود امام سجاد ع سے منقول ہے اور جس کے راوی ابو عمر نہدی ہیں امام علیہ السلام فرماتے ہیں:-

ما بمکّة والمدینة عشرین رجلاً یحبّنا[1]

پورے مکہ ومدینہ میں بیس افراد بھی ایسے نہیں ہیں جو ہم سے محبت کرتے ہوں

ہم نے یہ دونوں حدیثیں اس لئے نقل کی ہیں کہ اہلبیت طاہرین ع اور ان کے طرفداروں کے بارہ میں عالم اسلام کی مجموعی صورت حال کا اندازہ لگایا جا سکے۔ دراصل اس وقت ایسی خوف وہراس کی فضا پیدا ہوگئی تھی کہ ائمہ کے طرفدار متفرق وپراگندہ، مایوس ومرعوب زندگی گزار رہے تھے اور کسی طرح کی اجتماعی تحریک ممکن نہ تھی۔ البتہ جیسا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام

[1] بحار الانوار ج ۴۶ ص ۱۴۳، شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید ج ۴ ص ۱۰۴

مذکورہ بالا روایت میں ارشاد فرماتے ہیں :

ثم ان الناس لحقوا وکثروا

پھر آہستہ آہستہ لوگ (اہلبیت) سے ملحق ہوتے گئے اور تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

خفیہ تنظیمیں :

اگر یہی مسئلہ جس کا ابھی ہم نے ذکر کیا ہے ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کرنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ : کربلا کا عظیم سانحہ رونما ہونے کے بعد اگرچہ لوگوں کی خاصی تعداد رعب و وحشت میں گرفتار ہو گئی تھی پھر بھی خوف وہراس اتنا غالب نہ تھا کہ شیعیان اہلبیت کی پوری تنظیم یکسر درہم برہم ہو کر رہ گئی ہو جس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس وقت اسیران کربلا کا لٹا ہوا قافلہ کوفہ میں وارد ہوتا ہے کچھ ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں جو شیعہ تنظیموں کے وجود کا پتہ دیتے ہیں .

البتہ یہاں ہم نے جو شیعوں کی خفیہ تنظیم ، کا لفظ استعمال کیا ہے اس سے یہ غلط فہمی نہیں پیدا ہونی چاہیئے کہ یہاں ہماری مراد موجودہ زمانہ کی طرح سیاسی تنظیموں کی کوئی باقاعدہ منظم شکل ہے بلکہ ہمارا مقصود وہ اعتقادی روابط ہیں جو لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لاکر ایک مضبوط دھاگے میں پرو دیتے ہیں اور پھر لوگوں میں جذبۂ فداکاری پیدا کر کے خفیہ سرگرمی پر اکساتی

ہے اور نتیجہ کے طور پر انسانی ذہن میں ایک ہم فکر جماعت کا تصور پیدا ہو جاتا ہے۔

ان ہی دنوں جبکہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذریت کوفہ میں اسیر تھی ایک رات اسی جگہ جہاں ان کو قید رکھا گیا تھا، ایک پتھر آ گرا، اہلبیت اس پتھر کی طرف متوجہ ہوئے، دیکھا تو ایک کاغذ کا ٹکڑا اس کے ساتھ منسلک تھا جس پر کچھ اس طرح کی عبارت تحریر تھی: "کوفہ کے حاکم نے ایک شخص کو یزید کے پاس (شام) روانہ کیا ہے تاکہ آپ کے حالات سے اس کو باخبر کرے نیز آئندہ کے بارے میں اس کا فیصلہ معلوم کرے اب اگر کل رات تک (مثلاً) آپ کو تکبیر کی آواز سنائی دے تو سمجھ لیجئے کہ آپ کو یہیں قتل کر دینے کا فیصلہ ہوا ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو سمجھئے گا کہ حالات کچھ بہتر ہیں"[1]

جس وقت ہم یہ واقعہ سنتے ہیں تو اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اس تنظیم کے دوستوں یا ممبروں میں سے کوئی شخص ابن زیاد کے دربار میں موجود رہا ہوگا جس کو تمام حالات کی خبر تھی اور قید خانہ تک رسائی بھی رکھتا تھا حتیٰ کی اس کو یہ بھی معلوم تھا کہ قیدیوں کے سلسلہ میں کیا فیصلے اور منصوبے تیار کئے جا رہے ہیں اور صدائے تکبیر کے ذریعہ اہلبیت کو حالات سے باخبر کر سکتا ہے۔ چنانچہ اس شدت عمل کے ساتھ ساتھ جو وجود میں آچکی تھی، اس طرح کی چیزیں بھی دیکھی جا سکتی تھیں۔

[1] یہ واقعہ ابن اثیر نے اپنی تاریخ "الکامل" میں نقل کیا ہے۔

اس طرح کی ایک مثال عبداللہ بن عفیف ازدی کی ہے جو ایک مرد نابینا ہیں اور اسیران کربلا کے کوفہ میں ورود کے موقع پر ہی شدید ردّ عمل کا اظہار کرتے ہیں اور نتیجہ کے طور پر انہیں بھی جام شہادت نوش کرنا پڑتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس قسم کے افراد کیا کوفہ اور کیا شام ہر جگہ مل جاتے ہیں جو قیدیوں کی حالت دیکھ کر ان سے محبت کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں اور صرف آنسو بہانے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ایک دوسرے کی نسبت ملامت کے الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں (حتی کہ اس قسم کے واقعات دربار یزید اور ابن زیاد کی بزم میں بھی پیش آتے رہے ہیں۔)

لہٰذا اگرچہ حادثۂ کربلا کے بعد نہایت ہی شدید قسم کا خوف عوام و خواص پر طاری ہو چکا تھا پھر بھی ابھی اس نے وہ نوعیت اختیار نہیں کی تھی کہ شیعیان آل محمدؐ کی تمام سرگرمیاں بالکل ہی مفلوج ہو گئی ہوں اور وہ ضعف و پراگندگی کا شکار ہو گئے ہوں لیکن کچھ ہی دنوں بعد ایک دوسرا حادثہ کچھ اس قسم کا رونما ہوا جس نے ماحول میں کچھ اور گھٹن کا اضافہ کر دیا۔ اور یہیں سے امام جعفر صادق علیہ السلام کی حدیث: "ارتد الناس بعد الحسینؑ" کا مفہوم سمجھ میں آتا ہے امام علیہ السلام نے غالباً اسی حادثہ کے دوران یا اس کے بعد کے حالات کی طرف اشارہ فرمایا ہے یا ممکن ہے یہ بات اس درمیانی وقفہ سے متعلق ارشاد فرمائی ہو جوان کے

مابین گزرا ہے۔

ان چند برسوں کے دوران — اس عظیم حادثہ کے رونما ہونے سے پہلے شیعہ اپنے امور کو منظم کرنے اور اپنے درمیان پہلی سی ہم آہنگی دوبارہ واپس لانے میں لگے ہوئے تھے۔ اس مقام پر طبری اپنے تأثرات کا یوں اظہار کرتا ہے: "فلم یزل القوم فی جمع آلۃ الحرب والاستعداد للقتال..."

یعنی وہ لوگ (مراد گروہ شیعہ ہے) جنگی ساز و سامان اکٹھا کرنے نیز خود کو جنگ کے لئے آمادہ کرنے میں لگے ہوئے تھے چپکے چپکے شیعوں اور غیر شیعوں کو حسینؑ ابن علیؑ کے خون کا انتقام لینے پر تیار کر رہے تھے اور لوگ گروہ در گروہ ان کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے ان میں شمولیت اختیار کر رہے تھے اور یہ سلسلہ یونہی جاری رہا یہاں تک کہ یزید ابن معاویہ دنیا سے رخصت ہو گیا۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ باوجود اس کے ماحول میں گھٹن اور سراسیمگی بہت زیادہ پائی جاتی تھی پھر بھی اس طرح کی سرگرمیاں اپنی جگہ جاری تھیں (جیسا کی طبری کی عبارت سے پتہ چلتا ہے) اور شاید یہی وہ وجہ تھی جس کی بنیاد پر "جہاد الشیعہ" کا مولف اگرچہ شیعہ نہیں ہے اور امام زین العابدین علیہ السلام کے سلسلے میں صحیح اور مطابق واقع نظریات نہیں رکھتا پھر بھی

وہ اس حقیقت کو درک کر لیتا ہے اور اپنے احساسات کو ان الفاظ میں پیش کرتا ہے کہ:

"گروہ شیعہ نے حسینؑ کی شہادت کے بعد خود کو باقاعدہ تنظیم کی صورت میں منظم کر لیا، ان کے اعتقادات اور سیاسی روابط انھیں آپس میں مربوط کرتے تھے۔ ان کی جماعتیں اور قائد تھے اس طرح وہ فوجی طاقت کے مالک تھے چنانچہ توابین کی جماعت، اس تنظیم کی سب سے پہلی مظہر ہے۔"

ان حقائق کے پیش نظر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عاشور کے عظیم حادثہ کے زیر اثر اگرچہ بڑی حد تک شیعہ تنظیمیں ضعف و کمزوری کا شکار ہو گئی تھیں پھر بھی اس دوران شیعہ تحریکیں اپنی ناتوانی کے باوجود مصروف عمل رہیں جس کے نتیجہ میں پہلے کی طرح دوبارہ خود کو منظم کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔ یہاں تک کہ "واقعہ حرہ" پیش آیا۔ اور میں سمجھتا ہوں واقعہ حرہ، تاریخ تشیع میں نہایت اہم موڑ ہے۔ در اصل یہی وہ واقعہ ہے جس نے شیعہ تحریک پر بڑی کاری ضرب لگائی ہے۔

واقعہ حرہ

حرہ کا حادثہ تقریباً ۶۳ھ ہجری میں پیش آیا۔ مختصر طور پر اس حادثہ کی تفصیلات کچھ اس طرح ہیں کہ ۶۲ھ ہجری میں بنو امیہ کا کم تجربہ نوجوان مدینہ کا حکم مقرر ہوا اس نے خیال کیا کہ شیعیان مدینہ کا دل جیتنے کیلئے

بہتر ہو گا کہ ان میں سے کچھ لوگوں کو شام جا کر یزید سے ملاقات کرنے کی دعوت دی جائے چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا مدینہ کے چند سربرآوردہ افراد، اصحاب نیز دیگر معززین میں سے منتخب کئے جس میں اکثریت امام زین العابدین[4] کے عقیدتمندوں میں شمار ہوتی تھی ان لوگوں کو شام جانے کی دعوت دی گئی کہ وہ جائیں اور یزید کے لطف و کرم دیکھ کر اس سے مانوس ہو جائیں اور اس طرح اختلافات میں کمی واقع ہو جائے۔ یہ لوگ شام گئے اور یزید سے ملاقات کی چند دن اس کے مہمان رہے ان لوگوں کی خوب پذیرائی کی گئی اور رخصت ہوتے وقت یزید نے ہر ایک کو کافی بڑی رقم (تقریباً پچاس ہزار سے لیکر ایک لاکھ درہم تک) سے نوازا لیکن ــــ

جیسے ہی یہ لوگ مدینہ واپس پہونچے، چونکہ یزیدی دربار میں پیش آنے والے المیئے انھوں نے خود اپنی نظروں سے دیکھ لئے تھے لہٰذا خوب کھل کر یزید کو مورد تنقید قرار دیا اور نتیجہ بالکل ہی برعکس ظاہر ہوا ان لوگوں نے یزید کی تعریف و توصیف کرنے کے بجائے ہر خاص و عام کو اس کے جرائم سے آگاہ کرنا شروع کر دیا۔ لوگوں سے کہا: "یزید کو کس بنیاد پر خلیفہ تسلیم کیا جا سکتا ہے جبکہ شراب و کباب میں غرق رہنا اور کتوں سے کھیلنا اس کا بہترین مشغلہ ہے کوئی فسق و فجور ایسا نہیں، جو اس کے یہاں نہ پایا جاتا ہو۔ لہٰذا ہم اس کو خلافت سے معزول کرتے ہیں۔"

عبداللہ بن حنظلہ[1] جو مدینہ کی نمایاں اور محبوب شخصیتوں میں سے تھے، یزید کے خلاف آواز بلند کرنے والوں میں پیش پیش تھے ان لوگوں نے یزید کو معزول کر کے لوگوں کو اپنی طرف دعوت دینی شروع کردی۔

اس اقدام کا نتیجہ یزید کی طرف سے براہ راست ردعمل کی صورت میں ظاہر ہوا اس نے اپنے ایک تجربہ کار پیر فرتوت سردار، مسلم بن عقبہ کو چند مخصوص لشکریوں کے ساتھ مدینہ روانہ کیا کہ وہ اس فتنہ کو خاموش کردے۔ مسلم بن عقبہ مدینہ آیا اور چند روز تک اہل مدینہ کی قوت مقابلہ کو پست کرنے کے لئے شہر کا محاصرہ کئے رہا یہاں تک کہ ایک دن شہر میں داخل ہوا اور اس قدر قتل و غارت گری مچائی اور اس قدر ظلم و بربریت کا مظاہرہ کیا کہ تاریخ اسلام میں وہ آپ اپنی مثال ہے۔

اس نے مدینہ میں کچھ ایسا ہی قتل و غارتگری اور ظلم و زیادتی کا بازار گرم کیا تھا کہ اس حادثہ کے بعد اس کا لقب ہی 'مسرف' پڑ گیا اور لوگ اسکو "مسرف بن عقبہ" کے نام سے پکارنے لگے۔ 'حادثہ حرہ' سے متعلق واقعات کی فہرست کافی طویل ہے اور میں زیادہ تشریح میں جانا نہیں چاہتا صرف اتنا عرض کردینا کافی ہے کہ یہ واقعہ تمام مسلمانوں خصوصاً اہلبیت علیہم السلام کے دوستوں اور ہمنواؤں میں بے پناہ خوف و ہراس پیدا کرنے کا سبب

---

[1] حنظلہ ہی وہ نوجوان ہیں جو قبل اس کے کہ ان کی شب عروسی تمام ہو پیغمبر اسلام کی فوج میں آکر شامل ہوگئے اور میدان احد میں شہادت کا جام نوش فرمایا اور ملائکہ نے ان کو غسل دیا اسی لئے یہ حنظلہ غسیل الملائکہ کے نام سے معروف ہوئے۔

بنا۔ خاص طور پر مدینہ تقریباً خالی ہوگیا کچھ لوگ بھاگ گئے کچھ لوگ بھاگ گئے، کچھ لوگ مار ڈالے گئے اہلبیتؑ کچھ مخلص و ہمدرد مثال کے طور پر عبد اللہ ابن حنظلہ جیسے لوگ شہید کر دیئے گئے اور ان کی جگہ خالی ہوگئی۔ اس حادثہ کی خبر پوری اسلامی دنیا میں پھیل گئی اور سب سمجھ گئے کہ اس قسم کی ہر تحریک کا سد باب کرنے کیلئے حکومت پوری طرح آمادہ ہے اور کسی طرح کے اقدام کی اجازت دینے کو ہرگز تیار نہیں ہے۔

اس کے بعد ایک اور حادثہ — جو مزید شیعوں کی سرکوبی اور ضعف کا سبب بنا۔ مختار ثقفی کی کوفہ میں شہادت اور پورے عالم اسلام پر عبد الملک بن مروان کے تسلط کی صورت میں ظاہر ہوا۔

یزید کی موت کے بعد جو خلفاء آئے ہیں ان میں اس کا بیٹا معاویہ ابن یزید ہے جو تین ماہ سے زیادہ حکومت نہ کر سکا۔ اس کے بعد مروان بن حکم کے ہاتھ میں اقتدار آیا اور تقریباً دو سال یا اس سے کچھ کم اس نے حکومت کی اور پھر خلافت کی باگ ڈور۔ عبد الملک بن مروان کے ہاتھ میں آگئی جس کے لئے مورخین کا خیال ہے کہ وہ خلفائے بنوامیہ میں زیرک ترین خلیفہ رہا ہے۔ چنانچہ اس کے بارہ میں مشہور ہے کہ:۔

کان عبد الملک اشدھم شکیمۃ واقساھم عزیمۃ

عبد الملک پورے عالم اسلام کو اپنی مٹھی میں جکڑ لینے میں کامیاب

ہوگیا اور خوف و دہشت سے معمور عامرانہ حکومت قائم کردی.

حکومت پر مکمل تسلط حاصل کرنے کے لئے عبدالملک کے سامنے صرف ایک راہ تھی اور وہ یہ کہ اپنے تمام رقیبوں کا صفایا کردے. مختار، جو شیعیت کی علامت تھے، مصعب بن زبیر کے ہاتھوں پہلے ہی جام شہادت نوش فرما چکے تھے لیکن عبدالملک شیعہ تحریک کا نام ونشان مٹا ڈالنا چاہتا تھا اور اس نے یہی کیا بھی. اس کے دور میں عراق خصوصاً کوفہ، جو اس وقت شیعوں کا ایک گڑھ شمار کیا جاتا تھا، مکمل جمود اور خاموشی کی نذر ہوگیا.

بہر حال یہ حوادث کربلا کے عظیم سانحہ سے شروع ہوئے اور پھر یکے بعد دیگرے "واقعۂ حرہ" میں اہل مدینہ کے قتل و غارت، عراق میں توابین[1] کی بیخ کنی، جناب مختار ثقفی اور ابراہیم بن مالک اشتر نخعی نیز دیگر اکابرین شیعہ کی شہادت کا نتیجہ یہ نکلا کہ آزادی کے حصول کی غرض سے ہر تحریک چاہے وہ مدینہ ہو یا کوفہ (کیونکہ اس وقت یہ دونوں شیعوں کے اہم ترین مراکز تھے) کچل کر رکھ دی گئی. شیعت سے متعلق پورے عالم اسلام میں ایک عجیب خوف و ہراس پیدا ہوگیا.

---

[1] توابین کی تحریک واقعۂ کربلا کا سب سے پہلا ردعمل ہے جو کوفہ میں ظاہر ہوا. امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے بعد بعض شیعوں نے ایک دوسرے کو موردالزام ٹھہراتے ہوئے مواخذہ وعتاب کا مستحق قرار دیا کہ انہوں نے امام کی دعوت پر لبیک کیوں نہ کہی اور مدد کیلئے میدان میں نکلنے سے کیوں گریز کیا چنانچہ انھوں نے محسوس ←

اس کے بعد بھی جو لوگ ائمہ طاہرین سے وابستہ رہ گئے تھے اپنی زندگی نہایت
ہی عزبت و کسمپرسی میں بسر کر رہے تھے۔

اس دور میں امامؑ کا موقف

بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اگر امام زین العابدین علیہ السلام بھی
بنو امیہ کے نظام حکومت کے خلاف آواز بلند کرنا چاہتے ہوتے تو وہ بھی علم بغا
بلند کر دیتے یا کم از کم (مثال کے طور پر) عبداللہ بن حنظلہ یا مختار ثقفی سے ملحق
ہو جاتے یا یہ کہ آپؑ ان لوگوں کی رہبری قبول کر لیتے اور کھل کر مسلحانہ مقابلہ
کرتے۔ لیکن اگر اس دور کے حالات ہمارے پیش نظر ہوں جس میں امام سجادؑ
زندگی بسر کر رہے تھے تو ہمارے لئے سمجھنا مشکل نہ ہوگا کہ اس طرح کی فکر ائمہ
علیہم السلام کے مقصد سے (جسے ہم بعد میں بیان کریں گے) قطعی میل
نہیں کھاتی۔

اس گناہ سے اپنے دامن کو پاک کرنے کا طریقہ ہے کہ امام کے دشمنوں اور قاتلوں سے حضرت کے خون کا انتقام لیا
جائے، لہٰذا وہ لوگ کوفہ آئے اور اکابرین شیعہ میں سے پانچ افراد کو جمع کر کے ان سے اس سلسلے میں گفتگو کی اور نتیجہ کے طور پر سلیمان
بن صرد خزاعی کی قیادت میں کھلے طور پر مسلحانہ تحریک کا آغاز کر دیا۔ شب جمعہ ۲۵ ربیع الثانی ۶۵ھ ہجری کو امام حسین
علیہ السلام کی قبر مبارک پر زیارت کیلئے جمع ہوئے اس طرح فریاد و گریہ کرنا شروع کیا کہ آج تک اس گریہ و زاری کی مثال
نہیں ملتی۔ اس کے بعد قبر امام کو وداع کہہ کر شامی حکومت سے نبرد آزمائی کیلئے شام کا رخ کیا اور پھر لشکر بنو امیہ سے جم کر
جنگ ہوئی اور سب کے سب مارے گئے۔ توابین کی تحریک کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ یہ لوگ باوجود اسکے

ان حالات میں اگر امام زین العابدین علیہ السلام یا ائمہ علیہم السلام میں سے کوئی بھی ہوتا اور کھل کر کسی مخالف تحریک میں شامل ہو جاتا یا تلوار لیکے سامنے آگیا ہوتا تو یقینی طور پر شیعت کی جڑیں ہمیشہ کیلئے کٹ جاتیں اور پھر آئندہ کسی زمانہ میں مکتب اہلبیت کے نشو نما اور ولایت و امامت کے قیام کی کوئی امید باقی نہ رہ جاتی سب کچھ ختم اور نیست و نابود ہو کر رہ جاتا۔

بظاہر یہی وجہ نظر آتی ہے کہ امام سجادؑ مختار ثقفی سے مخفی طور پر رابطہ قائم تھا۔ چنانچہ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ امامؑ نے علی الاعلان ان سے کبھی کسی طرح کا رابطہ نہ رکھا بلکہ بعض روایتیں تو کہتی ہیں کہ حضرت عام نشستوں میں مختار سے اپنی ناراضگی کا اظہار بھی کرتے تھے اور یہ چیز بالکل فطری ہے ظاہر ہے آپ اس سلسلہ میں تقیہ سے کام لے رہے تھے تا کہ دشمن کو ان کے درمیان کسی خفیہ رابطے کا شک بھی نہ ہونے پائے۔

اگر مختار کو کامیابی نصیب ہو جاتی تو حکومت اہلبیت کے سپرد کر دیتے لیکن شکست کی صورت میں، جیسا کہ ہوا ــــ امام زین العابدینؑ علیہ السلام اور مختار کے درمیان رابطہ کا علم ہو جانے کے بعد خود امام علیہ السلام اور آپ کے دوستوں اور ہمنواؤں کو بھی اس کی سخت قیمت چکانی پڑتی اور شاید شیعیت کا قلع قمع ہو گیا ہوتا لہٰذا جناب امام سجادؑ ان سے کھل کر کسی طرح کا رابطہ برقرار کرنا کسی

...ہے کہ کوفہ میں تھے پھر بھی شام گئے اور برسر اقتدار حکومت سے جنگ کی تا کہ یہ ثابت کر دیں کہ امام حسین علیہ السلام کا قاتل کوئی ایک شخص یا چند اشخاص نہیں ہیں بلکہ یہ حکومت ہے جس نے امام کو شہید کیا ہے۔

طرح اپنے موقف کے لئے مفید نہیں سمجھتے۔

روایت میں ہے کہ جس وقت حادثہ حرہ کے موقع پر مسلم ابن عقبہ مدینہ منورہ پہنچ رہا تھا کسی کو شک نہ تھا کہ سب سے پہلی شخصیت جو اس کے ظلم و جور کا نشانہ بنے گی وہ امام زین العابدین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات مبارک ہے لیکن حضرتؑ نے اپنی تدبیر و فراست سے کام لیتے ہوئے ایسی حکیمانہ روش اختیار کی کہ یہ بلا آپ سے دور ہوگئی چنانچہ امامؑ کا وجود باقی رہا اور اس طرح شیعیت کا اصل محور اپنے مقام پر محفوظ رہ گیا۔

البتہ وہ روایتیں جو بعض کتب منجملہ ان کے خود بحار الانوار میں بھی نقل کی گئی ہیں کہ امام علیہ السلام نے مسلم بن عقبہ کے سامنے اپنی حقارت و عاجزی کا اظہار فرمایا، اس کو بھی میں کسی صورت قبول کرنے پر تیار نہیں ہوں بلکہ میری نظر میں یہ قطعی امام پر جھوٹ اور افترا باندھا گیا ہے کیونکہ:

اولاً — یہ کہ ان میں سے کوئی روایت صحیح اسناد پر مبنی نہیں ہوتی۔

ثانیاً — یہ کہ ان کے بالمقابل دوسری روایتیں موجود ہیں جو مضمون کے اعتبار سے ان کا جھوٹا ہونا ثابت کرتی ہیں۔

امام زین العابدین علیہ السلام ابن عقبہ کی ملاقات کے ذیل میں متعدد روایتیں ملتی ہیں اور ان میں سے کوئی ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتی لیکن چونکہ ان میں سے بعض روایات ائمہ علیہم السلام کی شخصیت اور ان کے

کردار سے زیادہ قریب ہیں لہٰذا ہم ان کو قبول کرتے ہیں اور طبعی طور پر قبول کرتے ہیں پھر ان کے بالمقابل بہت سی دوسری روایتیں خود بخود غلط قرار پا جاتی ہیں اور میرے نزدیک ان کے غلط ہونے میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہتا۔

بہرحال وہ اعمال جو بعض روایتوں میں بیان کئے گئے ہیں امام علیہ السلام سے بعید ہیں لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ حضرتؑ نے مسلم بن عقبہ کے مقابلہ میں کسی معاندانہ رویہ کا اظہار نہیں ہونے دیا کیونکہ اگر کوئی ایسا طریقہ کار آپ اپناتے تو قتل کر دیئے جاتے اور یہ چیز امام حسین علیہ السلام کی اس تحریک کے حق میں ایک ناقابل تلافی نقصان ثابت ہو سکتی تھی جس کو زندہ رکھنا امام سجاد کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ تھا لہٰذا ضروری تھا کہ امام سجادؑ زندہ رہیں اور اسی طرح جیسا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول روایت میں کہا گیا ہے۔ رفتہ رفتہ لوگ آپ سے ملحق ہوتے رہیں اور ان کی تعداد بڑھتی رہے۔ دراصل امام زین العابدینؑ کا کام ایسے سخت اور نامساعد حالات میں شروع ہوتا ہے۔ جس کا جاری رکھنا عام افراد کے لئے تقریباً ناممکن تھا۔

عبد الملک کا دور جس میں حضرت کی امامت کا بیشترین حصہ یعنی تقریباً ۳۰-۳۲ سال گزرا بڑا ہی دشوار دور تھا۔ عبد الملک کی پوری مشینری مکمل

طور پر آپ کی نگرانی پر لگی ہوئی تھی اس نے ایسے جاسوس مقرر کر رکھے تھے جو امام علیہ السلام کی زندگی کے ایک ایک پل حتی کہ خانگی اور خصوصی مسائل کی بھی خبر اس تک پہونچاتے رہتے تھے۔

امام زین العابدین علیہ السلام کے پاس ایک کنیز تھی جس کو آزاد کرنے کے بعد آپ نے اس سے شادی کر لی۔ یہ خبر عبد الملک کو معلوم ہوئی تو اس نے حضرت کے نام ایک خط روانہ کیا اور اس میں اس موضوع پر طنز و سرزنش کی وہ اس طرح باور کرانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ہم کو آپ کے تمام امور کی خبر ملتی رہتی ہے اور تمام معاملات زندگی کی خبر رکھتے ہیں اور ضمنی طور پر ہم خون اور ہم قبیلہ ہونے کی بنیاد پر بحث و مناظرہ بھی کرنا چاہتا تھا۔ وہ خط میں لکھتا ہے کہ آپ کا یہ کام قریش کی روش کے خلاف ہے اور آپ چونکہ قریش کی ہی ایک فرد ہیں لہذا آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ چنانچہ حضرتؑ بھی اس کا جواب بہت ہی تند و سخت لب و لہجہ میں دیتے ہیں۔ جو قابل توجہ ہے۔ آپ نے اپنے خط سے عبد الملک پر یہ واضح کر دیا کہ تیرا نیم دوستی اور نیم دشمنی پر محمول یہ خط کسی طرح بھی قابل قبول نہیں ہے۔

یہ واقعہ اس دور کا ہے جب حضرتؑ کسی حد تک اپنی جد و جہد کا آغاز کر چکے تھے۔

امام علیہ السلام کے مقاصد : امام سجادؑ نے کن حالات میں کام

کیا ہے یہ بات واضح ہو گئی، تو امام علیہ السلام ایسے حالات میں اپنی تحریک کا آغاز کرنا چاہتے ہیں۔ اس منزل میں ائمہ علیہم السلام کے مقصد اور طریقہ کار کے سلسلہ میں مختصر طور پر اشارہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں اس کے بعد اس روش اور طریقۂ کار کی روشنی میں امام علیہ السلام کی جزئیات زندگی پر روشنی ڈالنے کی کوشش کرونگا۔

اس میں تو کوئی شک نہیں کہ جناب امام سجاد کا آخری مقصد، اسلامی حکومت قائم کرنا ہے چنانچہ صادق آل محمدؐ کی اس روایت کے مطابق، جس کا ہم گذشتہ مقالہ میں ذکر کر چکے ہیں خداوند عالم کی طرف سے ۷۰ سنہ ہجری، اسلامی حکومت کی تاسیس کا سال قرار دیا گیا تھا مگر ۶۱ سنہ ہجری میں ہی امام حسینؑ کی شہادت واقع ہو گئی جس کے نتیجے میں یہ کام سن ۱۴۷-۱۴۸ تک کے لئے موقوف کر دیا گیا۔ یہ چیز کامل طور پر اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ جناب امام سجادؑ نیز دیگر ائمہ علیہم السلام کا آخری مقصد اسلامی حکومت قائم کرنا ہی رہا ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ان حالات میں حکومت اسلامی قائم کس طرح ہو سکتی ہے۔ اس کے لئے چند چیزیں بہت ضروری ہیں:

۱. صحیح اسلامی طرز فکر، جو واقعی طور پر ائمہ طاہرین علیہم السلام کے پاس تھی۔ مدون و مرتب ہو اور درس و تبلیغ کے ذریعہ عام کی جائے کیونکہ یہی طرز فکر ہے جس کو اسلامی حکومت کی بنیاد و اساس قرار

اس شور و غوغا سے لبریز ہو۔ پیغمبر اسلامؐ کی طرف منسوب کر کے ایسی جعلی حدیثوں کا انبار لگا دیا ہو جو اہل بیت کی تحریک کے سو فیصد خلاف ہوں حتی کہ بعض حدیثوں میں اہل بیت کو مورد سب و لعن تک قرار دے دیا گیا ہو، اور یہ حدیثیں عوام کے درمیان نشر بھی ہو چکی ہوں لوگوں کو اہلبیتؑ کی صحیح معرفت اور ان کی معنوی حیثیت اور مقام کا علم ہی نہ ہو ۔ تو بھلا بتائیے اہلبیتؑ کے ہاتھوں حکومت کی تشکیل کیسے ممکن ہو سکتی ہے ؟

اسی لئے امام زین العابدین علیہ السلام کا ایک اہم ترین مقصد یہ بھی تھا کہ لوگوں کے درمیان اہلبیتؑ کی حقانیت کو واضح و آشکار کریں انہیں بتائیں کہ ولایت و امامت اور خلافت و حکومت ان کا حق ہے یہی حضرات پیغمبر ختمی مرتبت کے حقیقی جانشین ہیں ۔ ساتھ ہی ساتھ لوگوں کو اس مسئلہ کی اہمیت سے بھی آگاہ کیا جائے چنانچہ اگرچہ یہ مسئلہ اسلامی نظریات اور آئیڈیلوجی سے تعلق رکھتا ہے ۔ پھر بھی اس کا سیاست سے بڑا گہرا رابطہ ہے دوسرے لفظوں میں موجودہ سیاسی نظام کے خلاف ایک سیاسی تحریک ہے ۔

۳۔ امام سجادؑ کی تیسری اہم ذمہ داری یہ تھی کہ ایک ایسی تنظیم تشکیل دی جائے جو آئندہ کیلئے ہر طرح کی سیاسی و اسلامی تحریک کا اصل محور قرار پا سکے لیکن ایک ایسے معاشرہ میں جہاں لوگ گھٹن، فقر، مالی و معنوی فشار کے زیر اثر افراتفری اور پراگندگی کی زندگی گزارنے کے

دیا جا سکتا ہے۔

اس حقیقت کے پیش نظر کہ مسلسل طور پر ایک لمبے عرصہ تک اسلامی معاشرہ صحیح اسلامی طرز فکر سے دوری اختیار کئے رہا بھلا کس طرح ممکن ہو سکتا تھا کہ لوگوں کے ذہنوں پر اسلامی افکار کا نقش قائم قائم کئے بغیر اسلامی نظریات پر مبنی ایک حکومت قائم کر دی جائے جبکہ ابھی حکومت کے حقیقی احکام کی تدوین و ترتیب بھی باقاعدہ عمل میں نہ آسکی ہو۔

امام زین العابدین علیہ السلام کا عظیم ترین کارنامہ یہی ہے کہ آپ نے اسلام کے بنیادی افکار و نظریات توحید، نبوت، انسان کی معنوی حیثیت، خدا اور بندہ کے درمیان رابطہ نیز دیگر اہم موضوعات کو مدون و مرتب کر دیا ہے چنانچہ زبور آل محمدؐ یعنی صحیفۂ سجادیہ کی اہم ترین خصوصیت یہی ہے اگر آپ صحیفۂ سجادیہ کا مطالعہ کریں اور اس کے بعد اس زمانے کی عام اسلامی فکر کا جائزہ لیں تو آپ دیکھیں گے کہ دونوں کے درمیان کتنا عمیق فاصلہ نظر آتا ہے ـــ جس وقت پورا عالم اسلام، مادیت میں گرفتار اپنی مادی ضروریات و خواہشات کی تکمیل میں سرگرداں و منہمک ہے خلیفۂ وقت (عبدالملک بن مروان) سے لیکر اس کے ارد گرد بیٹھنے والے علماء تک (مثال کے طور پر محمد بن شہاب زہری جیسے درباری علماء جنکا ذکر عنقریب آئے گا) سب کے سب مفاد پرستی اور دنیا طلبی میں غرق نظر آتے ہیں

۔۔۔ امام سجادؑ لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے ان کی اسلامی حمیت کو للکارتے ہیں :۔۔

او لا حر یدع ھٰذہ للماظۃ لاھلھا

آیا (تم میں) کوئی ایسا آزاد مرد نہیں ہے جو اس دریدہ دہن حریص کتے کا بچا کھچا اس کے اہل کے لئے چھوڑ دے۔

یہاں اسلامی طرز فکر سے مراد ۔۔۔ معنویات کو اصل ہدف قرار دیکر صحیح اسلامی و معنوی بلندیوں تک پہونچنے کی جدوجہد کرنا اور انسان کا اپنے معبود نیز اس کی طرف سے عائد شدہ ذمہ داریوں کے تئیں متوجہ رہنا ہے۔ جبکہ اس کے بالمقابل وہ مادی طرز فکر ہے جس نے اس دور کے مسلمانوں کو اپنا شکار بنا رکھا تھا۔

بہر حال صرف نمونہ کے طور پر ہم نے ایک بات یہاں ذکر کر دی ورنہ امام سجادؑ نے اس طرح کے بے انتہا امور انجام دیئے ہیں جس کے نتیجہ میں صحیح اسلامی طرز فکر اپنے اصل خدوخال کے ساتھ اسلامی معاشرہ میں باقی رہ جائے اور اس کو امام زین العابدین علیہ السلام کا اوّلین کارنامہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

۲۔ اسلامی حکومت کی تشکیل کے لئے حقدار افراد کی طرف عوام کی رہنمائی کرنا ۔۔ ان حالات میں جبکہ دسیوں سال سے پیغمبر اسلامؐ کی ذریت طاہرہ کے خلاف پروپیگنڈہ کا بازار گرم رہا ہو اور تقریباً پورا عالم اسلام

اس شور و غوغا سے لبریز ہو۔ پیغمبر اسلامؐ کی طرف منسوب کر کے ایسی جعلی حدیثوں کا انبار لگا دیا ہو جو اہل بیت کی تحریک کے سو فیصد خلاف ہوں حتیٰ کہ بعض حدیثوں میں اہل بیت کو مورد سب و لعن تک قرار دے دیا گیا ہو، اور یہ حدیثیں عوام کے درمیان نشر بھی ہو چکی ہوں لوگوں کو اہلبیتؑ کی صحیح معرفت اور ان کی معنوی حیثیت اور مقام کا علم ہی نہ ہو۔ تو بھلا بتائیے اہلبیتؑ کے ہاتھوں حکومت کی تشکیل کیسے ممکن ہو سکتی ہے؟

اسی لئے امام زین العابدین علیہ السلام کا ایک اہم ترین مقصد یہ بھی تھا کہ لوگوں کے درمیان اہلبیتؑ کی حقانیت کو واضح و آشکار کریں انہیں بتائیں کہ ولایت و امامت اور خلافت و حکومت ان کا حق ہے یہی حضرات پیغمبر ختمی مرتبت کے حقیقی جانشین ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ لوگوں کو اس مسئلہ کی اہمیت سے بھی آگاہ کیا جائے چنانچہ اگرچہ یہ مسئلہ اسلامی نظریات اور آئیڈیولوجی سے تعلق رکھتا ہے۔ پھر بھی اس کا سیاست سے بڑا گہرا ربط ہے دوسرے لفظوں میں موجودہ سیاسی نظام کے خلاف ایک سیاسی تحریک ہے۔

۳۔ امام سجادؑ کی تیسری اہم ذمہ داری یہ تھی کہ ایک ایسی تنظیم تشکیل دی جائے جو آئندہ کیلئے ہر طرح کی سیاسی و اسلامی تحریک کا اصل محور قرار پا سکے لیکن ایک ایسے معاشرہ میں جہاں لوگ گھٹن، فقر، مالی و معنوی فشار کے زیر اثر افرا تفری اور پراگندگی کی زندگی گزارنے کے

عادی ہو چکے ہوں حتی کہ خود شیعہ حضرات ایسے سخت دباؤ اور فشار میں مبتلا کر دیئے گئے ہوں کہ ان کی تنظیمیں درہم دبرہم ہو کر رہ گئی ہوں۔ بھلا امام زین العابدین علیہ السلام کیلئے کس طرح ممکن تھا کہ تن تنہا یا اپنے چند گنے چنے نامنظم مخلصین کے ساتھ اپنا کام شروع کر سکیں؟

چنانچہ کسی تحریک کے آغاز سے پہلے امامؑ کے لئے ضروری تھا کہ وہ شیعوں کو منظم کریں اور باقاعدہ ان کی تنظیمیں تشکیل دیں۔ اور یہ چیز جہاں تک میری نظر ہے، امیر المومنین علیہ السلام کے دور میں موجود تھی البتہ بعد میں کربلا کے المناک سانحہ، مدینہ میں حرہ کے حادثہ اور کوفہ میں مختار کے واقعہ نے تقریباً ان کی بنیادیں متزلزل کر کے رکھ دی تھیں اب ضرورت تھی کہ ان کو دوبارہ منظم کر کے ان میں ایک نئی روح پھونک دی جائے۔

مختصر یہ کہ جناب امام سجادؑ کو اپنی تحریک آگے بڑھانے کے لئے بنیادی نوعیت کے حامل تین اہم کام انجام دینے تھے۔

اوّل: منزل من اللہ، صحیح اسلامی افکار و نظریات کی تدوین و ترتیب، جو ایک مدت سے تحریف یا فراموشی کی نذر کر دیئے گئے تھے۔

دوّم: اہلبیت علیہم السلام کی حقانیت اور خلافت و امامت و ولایت پر ان کے استحقاق کا اثبات۔

سوم: شیعیان آل محمد کو ایک نقطہ پر جمع کر کے ان کی ایک باقاعدہ

تنظیم کی تشکیل۔

یہی وہ تین بنیادی کام ہیں جنکا ہمیں تفصیل سے جائزہ لینا ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ ان میں سے کون سا کام امام سجادؑ کے زمانہ میں انجام پایا۔ اگرچہ ان تین امور کے علاوہ اور بھی بہت سے کام انجام پانے تھے مگر ان کو ضمنی و ثانوی حیثیت حاصل ہے۔ منجملہ اس کے کبھی کبھی خود امام علیہ السلام یا آپ کے ساتھیوں کے ذریعہ ایسے اقدامات عمل میں آئیں یا ایسے افکار و خیالات پیش کئے جائیں جو اس گھٹن کے ماحول میں کسی حد تک تبدیلی لا سکیں۔

چنانچہ ایسے متعدد واقعات ملتے ہیں جہاں مجمع عام میں امامؑ کے ہمنوا یا خود امام علیہ السلام کچھ ایسے خیالات کا اظہار فرماتے نظر آتے ہیں جس کا مقصد محض اس گھٹن کی فضا کو توڑ کر اس منجمد ماحول میں ہوا کا ایک تازہ جھونکا پیدا کرنا تھا (البتہ اس طرح کے واقعات بھی اس دور کے ہیں جب تحریک میں کچھ استحکام پیدا ہو چلا تھا) ہے۔

بہر حال یہ وہ ضمنی اقدامات ہیں جس کے چند نمونے یاد دہانی کے طور پر آگے چل کر ہم پیش کریں گے۔ اسی طرح کا ایک اور ضمنی کام براہ راست موجودہ سیاسی مشنری یا اس کے لواحقین کے ساتھ معمولی طور پر پنجے لڑم کرنا بھی ہے چنانچہ اس طرح کے قضیے امام علیہ السلام اور عبدالملک

بن مروان کے درمیان بار بار پیش آتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ اس ضمن میں حضرت اور عبدالملک سے وابستہ (محمد بن شہاب زہری جیسے) منحرف علماء کے درمیان پیش آنے والے معاملات بھی شامل ہیں۔ اسی طرح امام علیہ السلام کے دوستوں اور خلفائے وقت کے درمیان ہونے والی بعض معرکہ آرائیاں بھی اسی فہرست میں آتی ہیں۔ اور ان سب کا ہدف و مقصد کسی حد تک اس حبس اور گھٹن کے ماحول سے لوگوں کو نجات دلانا تھا۔ انشاء اللہ آئندہ مقالوں میں ان جزئیات پر تفصیلی بحث کی جائے گی۔

اگر کوئی شخص صرف اسی حد تک میرے تمام معروضات کو اچھی طرح درک کرے تو ساری کی ساری اخلاقی روایات موعظانہ گفتگو اور پیغامات، عارفانہ اور اد و دعائیں نیز دیگر بے بہا اقوال و ارشادات جو امام چہارم علیہ السلام سے مروی ہیں یا امام علیہ السلام کی زندگی میں واقع ہوتے رہے ہیں خود بخود ایک معنی پیدا کرلیں گے یعنی وہ شخص اس بات کو محسوس کرنے پر مجبور ہو جائے گا کہ امام علیہ السلام کے تمام اقدامات وارشادات ان ہی تینوں خطوط کے ارد گرد گھومتے نظر آئیں گے۔ جن کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا ہے اور مجموعی طور پر ان تمام امور کا ایک ہی مقصد و ہدف یعنی ایک اسلامی حکومت کی تشکیل ہے۔

البتہ یہاں یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ امام سجادؑ کو ہرگز اس بات

کی فکر اور جلدی نہیں تھی کہ مطلوبہ اسلامی حکومت خود آپ کے زمانے میں ہی تشکیل پا جائے بلکہ آپ جانتے تھے کہ یہ کام مستقبل قریب میں آپ کے فرزند امام جعفر صادق علیہ السلام کے ہاتھوں انجام پانا مقرر ہو چکا ہے۔

اسلامی حکومت کی تشکیل ہمارے تمام ائمہؑ منجملہ ان کے امام زین العابدین علیہ السلام کا بنیادی مقصد و ہدف تھا چنانچہ اس سلسلہ میں امام علیہ السلام کو تین امور اہم ترین انجام دینے تھے کیونکہ ان مقدماتی منزلوں کو طے کئے بغیر اسلامی حکومت کی تشکیل ممکن ہی نہیں تھی:

پہلا کام:

لوگوں میں صحیح اسلامی طرز فکر پیدا کرنا تھا جو گزشتہ حاکمان جور کے ہاتھوں ایک مدت سے خود فراموشی یا تحریف کی نذر ہو چکا تھا چنانچہ ان کو اپنی اصلی و ابتدائی شکل و صورت میں واپس لانے کیلئے پورے اسلامی معاشرہ میں ہر خاص و عام کو جس حد تک بھی ممکن ہو سکے اور جہاں جہاں تک بھی امام کی تبلیغ و تعلیم کی آواز پہونچ سکے اسلامی اصول و حقائق سے آشنا کرنا بے حد ضروری تھا۔

دوسرا کام:

مسئلہ امامت کی حقیقت سے لوگوں کو واقف بنانا تھا یعنی عوام کے درمیان اسلامی حکومت، اسلامی حاکمیت اور اسلامی حاکمیت کو قائم

کرنے کے لئے مستحق و موزوں افراد کی نشان دہی کرنی تھی۔ ان کو یہ بتانا تھا کہ اس وقت جو لوگ خلافت و حکومت پر براجمان ہیں حاکمان کفر و استبداد اور مربیان فسق و نفاق ہیں، اور آج اسلامی معاشرہ میں عبدالملک بن مروان جیسوں کی حکومت، وہ حاکمیت نہیں ہے جو اسلام اپنے معاشرہ کے لئے چاہتا ہے کیونکہ جب تک عوام ان مسائل سے آگاہ و ہوشیار نہ ہونگے اور اپنے آپ میں نہ آئیں گے رفتار زمانہ کے ہاتھوں ان پر جو بے حسی طاری ہوگئی ہے اس کے گرد و غبار جب تک ذہنوں سے صاف نہ ہو جائیں گے امام علیہ السلام کی نگاہ میں حاکمیت کا جو تصور ہے ان کے لئے کبھی قابل قبول نہ ہوگا۔

تیسرا کام:

ایک ایسی جماعت اور تنظیم تشکیل دینا جس سے وابستہ افراد دست امامت کے تربیت یافتہ مرکزی ارکان ہوں۔

ان تینوں بنیادی کاموں کے انجام پا جانے کا مطلب یہ ہے کہ اب اسلامی حکومت یا علوی نظام کے لئے زمین ہموار ہو چکی ہے۔ البتہ ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں اور یہاں پھر یہ بات واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے برخلاف امام زین العابدین علیہ السلام کے پیش نظر یہ بات ہرگز نہیں تھی کہ خود ان کے زمانہ میں ہی یہ حاکمیت

تبدیل ہو کر حکومت اسلامی قائم ہو جائے کیونکہ معلوم تھا کہ امام زین العابدین
کے زمانہ میں اس کے لئے زمین ہموار نہ ہو سکے گی۔ ظلم و زیادتی، حبس اور گھٹن
کا ماحول کچھ اتنا زیادہ تھا کہ محض تینتیس سال کی مدت میں اس کا برطرف
ہو جانا ممکن نہ تھا چنانچہ امام سجادؑ مستقبل کے لئے زمین ہموار کر رہے تھے۔
حتیٰ کہ ایسے بھی متعدد قرآئن ملتے ہیں جس کے مطابق امام محمد باقر علیہ السلام
کا بھی اپنی زندگی کے دوران ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا کہ خود اپنے دور میں ہی
اسلامی حکومت تشکیل دیدیں یعنی ۶۱ ھ ہجری سے ۹۵ ھ ہجری تک جبکہ
امام سجادؑ کی شہادت واقع ہوئی اور پھر ۹۵ھ سے ۱۱۴ھ ہجری تک جو امام
محمد باقر علیہ السلام کا دور امامت ہے ان میں سے کوئی بھی خود اپنے زمانے
میں ہی حکومت اسلامی تشکیل دے دینے کی فکر میں نہیں تھا لہٰذا ان
کی نظریں ایک مدت دراز کے بعد ظاہر ہونے والے نتائج پر تھیں چنانچہ جیسا
کہ میں نے اشارتاً عرض کیا امام سجادؑ کا طریقۂ کار طویل المدت کیلئے
تھا۔

اب ہم امام زین العابدین علیہ السلام کے ارشادات عالیہ کا
جائزہ لیتے ہوئے اپنے معروضات کا ثبوت، خود امام علیہ السلام کے
اقوال میں تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ امام سجادؑ کی زندگی کے
بارہ میں کوئی تحقیقی جائزہ پیش کرتے وقت ہمارے بنیادی مصادر و

ماخذ خود امام علیہ السلام کے کلمات مبارکہ ہی ہونے چاہئیں ---- اور یہی طریقہ و روش دیگر ائمہ علیہم السلام کے سلسلہ میں بھی ہم نے اختیار کیا ہے کیونکہ ہماری نظر میں کسی بھی امامؑ کی زندگی سے متعلق صحیح معرفت و آشنائی کے لئے خود اس امامؑ کی زبان مبارک سے جاری ہونے والے بیانات یا روایتیں بہترین منبع و مدرک ہیں۔ لیکن ہم اس سے قبل بھی ایک مقالہ میں یہ اشارہ کر چکے ہیں کہ ہم امامؑ کے بیانات کو صرف اس وقت صحیح طور پر سمجھ سکتے ہیں جب موقف و مقصد، راہ عمل اور تلاش و جستجو سے آشنا ہوں ورنہ ہم جو بھی تفسیر کریں گے وہ غلط ہو گی اور خود یہ آشنائی بھی ان کے کلمات کی برکت سے ہی حاصل ہوئی ہے تو آپ دیکھیں گے کہ ائمہ علیہم السلام کے کلمات سے کتنے صحیح نتائج اس سلسلہ میں ہم کو حاصل ہوں گے۔

قبل اس کے کہ اس بحث میں وارد ہوں ایک اہم نکتہ کی طرف بطور اختصار اشارہ کر دینا ضروری ہے اور وہ یہ کہ امام علیہ السلام چونکہ انتہائی گھٹن کے ماحول میں زندگی بسر کر رہے تھے اور آپ کے لئے ممکن نہیں تھا۔ کہ کھل کر صریحی طور سے اپنے موقف اور نظریات بیان کر سکیں لہٰذا آپ نے دعا اور موعظہ کو اپنے اظہار کا ذریعہ قرار دیا ہے دعا صحیفۂ سجادیہ، سے مربوط ہے جس کا ہم آئندہ ذکر کریں گے البتہ موعظہ کا تعلق

ان اقوال و روایات سے ہے جو حضرتؑ سے نقل ہوئی ہیں۔ امام علیہ السلام کے زیادہ تر ارشادات یا شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ تمام کے تمام بیانات موعظ کے لب و لہجہ میں ہیں۔ چنانچہ اسی موعظہ اور نصیحت کے ضمن میں، وہ باتیں جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے، امام نے بیان فرمادی ہیں۔ جس وقت آپ ان بیانات کا نگاہ غائر سے مطالعہ کریں گے تو دیکھیں گے کہ امام نے کتنا حکیمانہ اور مدبرانہ طریقہ کار منتخب کیا ہے۔ بظاہر تو ایسا لگتا ہے کہ امام علیہ السلام لوگوں کو وعظ و نصیحت کر رہے ہیں لیکن اسی ضمن میں جو باتیں لوگوں کے ذہن میں بیٹھانا چاہتے ہیں، غیر محسوس طور پر لوگوں تک پہونچا دیتے ہیں اور یہ افکار و نظریات کے ابلاغ کا بہترین طریقہ ہے۔

یہاں ہم امام علیہ السلام کے اُن کلمات کی تحقیق و تشریح کرنا چاہتے ہیں جو کتاب "تحف العقول" میں حضرت سے نقل کئے گئے ہیں۔ اسی میں وہ مطالب جو امام سجادؑ سے نقل ہوئے ہیں ہمیں چند نوعیت کے حامل نظر آتے ہیں جو انھیں مذکورہ جہات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

ان میں بعض بیانات وہ ہیں جن میں عام لوگوں سے خطاب ہے جیسا کہ خود بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے سننے اور پڑھنے والے امام علیہ السلام کے خاص الخاص افراد نہیں ہیں۔ چنانچہ عام لوگوں

سے خطاب کرتے وقت ہمیشہ قرآنی آیات سند کے طور پر پیش کی گئی ہیں کیونکہ عوام الناس امام کو امام کی حیثیت سے نہیں پہچانتے وہ تو ہر بات کیلئے دلیل واستدلال چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام یا تو براہ راست آیات سے استدلال پیش کرتے ہیں یا آیات سے مدد لیتے ہیں۔ اس روایت میں تقریباً پچاس یا اس سے بھی زائد موارد میں قرآنی آیات کا براہ راست یا استعارہ کے طور پر استعمال نظر آتا ہے۔

لیکن بعد کے بیان میں جہاں مومنین سے خطاب ہے ایسا نہیں ہے کیونکہ وہ امام کی معرفت رکھتے ہیں اور ان سے امام اپنی گفتگو کے دوران چونکہ وہ امام کی بات قبول کرتے ہیں، قرآن سے استدلال پیش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ چنانچہ اگر شروع سے آخر تک جائزہ لیں تو قرآنی آیات بہت کم نظر آتی ہیں۔

امامؑ سے ایک مفصل روایت نقل کرتے ہوئے" صاحب تحف العقول" فرماتے ہیں:۔

موعظته لسائر اصحابه وشیعته وتذکیره ایاهم کل یوم جمعة

یعنی یہ موعظ اس لئے تھا کہ حضرت کے شیعہ اور حضرت کے دوست ہر جمعہ کے دن اپنوں کے مجمع میں یا تنہا انفرادی طور پر اسے پڑھا کریں۔

یہاں مخاطبین کا دائرہ کافی وسیع ہے اور یہ نکتہ خود اس تفصیلی روایت میں پائے جانے والے قرآن سے استنباط کیا جاسکتا ہے کیونکہ اس روایت میں خطاب ایھا المومنون، ایھا الاخوۃ یا اسی کے مثل کسی اور عنوان سے نہیں ہے بلکہ ایھا الناس، سے خطاب ہے جو عمومیت پر دلالت کرتا ہے جبکہ بعض دوسری روایتوں میں خود خطاب کا انداز مومنین سے خطاب ہونے کی نشاں دہی کرتا ہے۔ لہٰذا یہاں عمومی خطاب ہونا ثابت ہے۔

اس کے علاوہ اس روایت میں موجودہ نظام کو صاف اور صریحی انداز سے مورد مواخذہ وعتاب قرار دیئے جانے کی کوئی علامت نہیں پائی جاتی۔ صرف عقائد یا وہ باتیں بیان کی گئی ہیں جن کا جاننا انسان کیلئے ضروری ہے دوسرے لفظوں میں محض اعتقادات ومعارف اسلامی کی یاد دہانی کرائی گئی ہے۔ جیساکہ ہم نے عرض کیا پورا خطاب موعظ کے لب ولہجہ میں ہے جس کی ابتدا ان الفاظ میں ہوتی ہے:۔

"ایھا الناس اتقوا اللہ واعلموا انکم الیہ راجعون"

گفتگو ہی موعظ سے شروع ہوتی ہے کہ اے لوگو! تقوائے الٰہی اختیار کرو اور یاد رکھو کہ آخر خدا کو منہ دکھانا ہے۔

اس کے بعد عقائد اسلامی کی طرف لوگوں کو متوجہ کرتے ہوئے

فرماتے ہیں کہ تمہارا فرض ہے کہ اسلام کو صحیح طور پر سمجھنے کی کوشش کرو جس کا مطلب و مفہوم یہ ہے کہ تم اسلام کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکے ہو گویا اس بیان کے ذیل میں لوگوں کے اندر اسلام کی صحیح شناخت کا جذبہ بیدار کر رہے ہیں۔

اسی طرح ذرا دیکھئے کہ کتنے حسین انداز میں امام سجادؑ فرماتے ہیں:

" الا وان اول ما یسالانک عن ربک الذی کنت تعبدہ "

اسی موعظانہ تقریر میں ذیل میں آگے بڑھ کر فرماتے ہیں: اس وقت سے ڈرو جب تم کو لوگ تن تنہا قبر کے حوالے کر دیں گے اور منکر و نکیر تمہارے پاس آئیں گے اور پہلی چیز جس کے بارہ میں تم سے سوال کریں گے، تمہارے خدا سے متعلق ہوگی جس کی تم پرستش و عبادت کرتے ہو، یعنی سننے والوں کے ذہن میں توحید کا مفہوم اتار کر معرفت خدا کی لہر پیدا کر رہے ہیں۔

" وعن نبیک الذی ارسل الیک "

اور تم سے اس نبی کے بارہ میں سوال کریں گے جو تمہاری طرف بھیجا گیا تھا۔

گویا مسئلہ نبوت اور حقیقت محمدیؐ کے عرفان کا جذبہ زندہ کر رہے ہیں۔

" وعن دینک الذی کنت تدین بہ "

اور اس دین کے بارے میں پوچھیں گے جس کی تم نے پیروی کی ہے۔

"وعن کتابک الذی کنت تتلوه"

اور تمہاری اس کتاب کے سلسلے میں خبر لیں گے جسکی تم تلاوت کیا کرتے تھے۔

اور پھر مذہب اسلام کے ان ہی بنیادی و اساسی مسائل و عقائد یعنی توحید، نبوت، قرآن اور دین کے ساتھ ہی ساتھ اپنے مدنظر اصلی نکتہ کی طرف بھی لوگوں کو متوجہ کر دیتے ہیں :۔

"وعن امامك الذی کنت تتولاه"

اور اس امام کے بارہ میں بھی سوال ہو گا جس کی ولایت کا تم دم بھرتے رہے ہو۔

یہاں امام علیہ السلام مسئلہ امامت کو واضح کر رہے ہیں در اصل ائمہ علیہم السلام کے یہاں مسئلہ امامت مسئلہ حکومت سے الگ نہیں ہے ائمہ کے نزدیک مسئلہ ولایت اور مسئلہ امامت میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔ اگرچہ ممکن ہے 'ولی' اور 'امام' کے معنی آپس میں کچھ تفاوت رکھتے ہوں لیکن یہ دونوں مسئلہ ــــ مسئلہ امامت و مسئلہ ولایت ــــ ائمہ کی زبان میں ایک ہیں اور ان سے ایک ہی معنی مراد ہیں۔ اس جگہ حضرتؑ اسی امام کے بارہ میں سوال کی بات کر رہے ہیں جو دینی طور پر لوگوں کی ہدایت و آگاہی کا بھی متکفل و ذمہ دار بنایا گیا ہے اور دنیوی اعتبار

سے ان کے امور زندگی کا بھی نگراں اور ذمہ دار قرار دیا گیا ہے یعنی پیغمبر اسلام کا جانشین۔

یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آج ہم جس دور میں زندگی گزار رہے ہیں (موجودہ ایران میں) لوگ امام کا مطلب اچھی طرح سمجھنے لگے ہیں گزشتہ زمانہ میں عوام اس کا صحیح مفہوم درک کرنے سے قاصر تھے۔ آج ہم جانتے ہیں امام یعنی معاشرہ کا رہبر و قائد۔ امام یعنی وہ جس سے ہم دین بھی حاصل کرتے ہیں اور دنیا بھی اسی کے ہاتھ میں ہے جس کی اطاعت ہم پر دینی امور میں بھی واجب ہے اور دنیوی معاملات میں بھی فرض ہے۔

خوش قسمتی سے، انقلاب کے بعد، لفظ امام نے ہمارے ذہنوں میں اپنا صحیح مقام حاصل کرلیا ہے ورنہ آپ ملاحظہ فرمائیں صدیوں سے دنیائے تشیع میں یہ مسئلہ کتنی غلط فہمی کا شکار رہا ہے لوگ خیال کرنے لگے تھے کہ ایک شخص وہ ہے جو معاشرہ پر حکومت کر رہا ہے نظم زندگی سے متعلق امور اس کے ہاتھ میں ہیں بندش و آزادی سے لیکر جنگ و صلح تک سب کچھ اسی کے اختیار میں ہے وہی مالیات (ٹیکس) مقرر کرتا ہے اور وہی ہمارے اچھے اور برے کا مالک و ذمہ دار ہے اور اسی کے بالمقابل ایک شخص اور بھی ہے جس کا کام لوگوں کا دین درست کرنا ہے پہلے کو حاکم کہتے ہیں دوسرے کو غیبت کے زمانے

میں عالم، اور قبل از غیبت " امام کہتے ہیں۔ یعنی ائمہ علیہم السلام کے زمانہ میں ایک امام کی منزل ہم وہی تصور کرنے لگے تھے جو غیبت امام عج کے زمانے میں ایک عالم دین کی ہوتی ہے۔ ظاہر ہے یہ تصوّر قطعاً غلط ہے۔

دراصل ' امام، پیشوا اور ہادی کو کہتے ہیں جیسا کہ ہم صادق آل محمدؐ کے حالات زندگی کے ذیل میں اشارہ کر چکے ہیں کہ جس وقت امام منیٰ یا عرفات میں پہونچتے ہیں ایک مرتبہ بہ آواز بلند ارشاد فرماتے ہیں۔

"یا ایہا الناس ان رسول اللّٰہ وھو الامام"

یعنی پیغمبر اسلامؐ امام تھے، امام اس کو کہتے ہیں جو لوگوں کے دین اور دنیا دونوں کا ذمہ دار ہوتا ہے، چنانچہ امام سجادؑ کے دور میں بھی جس وقت اسلامی معاشرہ کی حکومت و فرمانروائی عبدالملک بن مروان کے ہاتھ میں تھی، لوگ امام کا مفہوم غلط سمجھ بیٹھے تھے ۔۔ معاشرہ کی امامت کا مطلب ہی لوگوں کے مسائل حیات نیز تمام بندش و آزادی کے نظام کی نگرانی و تحفظ کرنا ہے اور یہ " امامت " کا ایک بڑا ہی اہم شعبہ ہے ۔ یہ منصب اہل سے لیکر نااہلوں کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ اور وہ نااہل خود کو امام، سمجھتا بھی تھا ہی نہیں بلکہ عرصہ تک عوام بھی اس کو امام ہی سمجھا کرتے تھے۔ چنانچہ لوگ عبدالملک سے پہلے مروان بن حکم اور اس سے پہلے یزید اور اس کے پیش رووں کی اسی طرح عبدالملک کے بعد اس کی جگہ پر آنے والے

دوسرے لوگوں کو اپنا امام تصور کرتے رہے ان کو معاشرہ کا رہبر، نیز لوگوں کے اجتماعی مسائل پر حاکم کے عنوان سے قبول کرتے تھے۔ اور یہ بات لوگوں کے ذہنوں میں بیٹھ چکی تھی۔

جس وقت امام زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں: قبر میں تم سے امامت کے بارہ میں سوال کیا جائے گا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ امامؑ متوجہ کرنا چاہتے ہیں کہ فیصلہ کر لو کہ جب نکیرین سوال کریں گے کہ آیا تم نے جس کو اپنا امام منتخب کیا تھا وہ واقعی امام تھا؟ وہ شخص جو تم پر حکومت کر رہا تھا، معاشرہ کی رہبری جس کے ہاتھ میں تم نے دے رکھی تھی کیا وہ حقیقتاً امام ہونے کا مستحق تھا؟ کیا وہ وہی شخص تھا جس کی امامت پر خدا راضی تھا؟ اس کا کیا جواب دو گے؟ یعنی اس طرح حضرتؑ لوگوں کو اس مسئلہ کی نزاکت کا احساس دلا کر انھیں بیدار کر رہے تھے۔ گویا بالکل غیر محسوس طور پر مسئلہ امامت، جس کے سلسلہ میں بنو امیہ کی پوری مشینری کسی طرح کی کوئی بات سننے پر قطعی تیار نہ تھی امام علیہ السلام اس کو موعظہ میں ڈھال کر ایک عمومی خطاب کے ضمن میں پیش کر کے لوگوں کے ذہن و احساس کو زندہ و بیدار کر رہے تھے۔ یہاں امام علیہ السلام کی روش اور طریقۂ کار میں ٹھہراؤ پایا جاتا ہے کسی طرح کی عجلت نظر نہیں آتی۔ آگے چل کر جہاں امامؑ نے ذرا سختی اور تیزی سے کام لیا ہے ہم اس کا بھی ذکر کریں گے۔

مختصر یہ کہ عوام الناس سے مربوط اپنے عمومی خطاب میں، امام علیہ السلام موعظہ کی زبان میں اسلامی معارف منجملہ وہ حقائق جن پر حضرت کی خاص توجہ تھی، لوگوں کے ذہنوں میں زندہ کر رہے ہیں آپ کی کوشش ہے کہ عوام ان چیزوں کو یاد رکھیں۔ اس قسم کے خطابات میں دو نکتے خاص طور پر توجہ کے مستحق ہیں۔

اولاً یہ کہ عوام الناس سے کئے جانے والے یہ خطاب تعلیمی نقطۂ نظر سے نہیں پیش کئے گئے ہیں بلکہ ان کی نوعیت تذکر و یاد دہانی کی ہے یعنی یہاں امام علیہ السلام بیٹھ کر عوام کے سامنے مسئلہ توحید کے دریچے کھولنے یا مسئلۂ نبوت کی گتھیاں سلجھانے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ محض تذکر و یاد دہانی مقصود ہے۔

مثلاً مسئلہ نبوت کو لے لیجئے۔ ظاہر ہے امام سجادؑ جس معاشرہ اور جس زمانہ میں زندگی بسر کر رہے تھے ابھی پیغمبر اسلامؐ کو گزرے ہوئے اتنی زیادہ مدت نہیں ہو گئی تھی کہ مکمل طور سے اعتقادات اسلامی انحراف یا تحریف کا شکار ہو چکے ہوں اس زمانہ میں بہت سے ایسے لوگ موجود تھے جنھوں نے پیغمبر اسلامؐ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اور ائمہ اطہار میں سے ۔ امیر المومنینؑ امام حسن اور امام حسین علیہم السلام کو دیکھنے والے بھی موجود تھے اور اجتماعی نظام کے

اعتبار سے ابھی وہ نوبت نہیں پہونچی تھی کہ لوگ مسئلہ توحید و نبوت کے سلسلہ میں یا مسئلہ معاد و قرآن کے بارہ میں کسی بنیادی و اصولی شک و شبھ اور تحریف سے دوچار ہوں ۔ ہاں یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ اکثریت ان کو بھلا بیٹھی تھی ۔ مادی زندگی اس بات کی موجب ہوئی کہ لوگ اسلام، اسلامی اعتقادات اور ان کی عظمت و اہمیت کے بارہ میں فکر کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے تھے ۔

معاشرہ میں دنیوی و مادی طمع نے اس شدت کے ساتھ لوگوں کو اپنا اسیر بنا لیا تھا کہ اصلاً یہ فکر کہ انسانی زندگی میں معنویات و خیرات کے سلسلے میں تقابل و موازنہ کا بھی کوئی میدان موجود ہے، لوگوں کے ذہنوں سے بالکل نکل چکا تھا اور کسی کو اس میدان میں آگے بڑھنے کی کوئی فکر نہ تھی اور اگر اس طرف کوئی قدم بڑھاتا بھی تو اس میں ظاہر داری اور سطحیت کا عمل دخل ہوتا ۔ توحید کے وہ آثار و فوائد جو پیغمبر اکرمؐ کے دور میں یا اس سے متصل قریبی زمانہ میں لوگوں پر مرتب ہوئے تھے اور اس سلسلہ میں وہ احساس و ادراک اور وہ ذمہ داری اب مفقود ہو چکی تھی لہٰذا فقط تذکرہ و یاد دہانی کی ضرورت تھی تاکہ لوگوں میں ادراک پیدا ہو جائے ورنہ دین میں ابھی کوئی ایسی تحریف نہیں ہوئی تھی جس کی تصحیح ضروری ہو اس کے برخلاف بعد کے زمانوں میں، مثال کے طور پر امام جعفر صادق علیہ السلام

کے دور کو لیجئے، یہ بات اپنی حد سے آگے بڑھ چکی تھی اس وقت خود مسلمانوں
کے درمیان بہت سے متکلمین یا دوسرے لفظوں میں بہت سے فلسفی
اور منطقی پیدا ہو گئے تھے جو طرح طرح کے ناموں سے بڑی بڑی مسجدوں
— مسجد مدینہ، مسجد شام حتیٰ کہ خود مسجد الحرام میں آکر بیٹھ جاتے تھے
اور غلط افکار و عقائد کی باقاعدہ تعلیم و تدریس فرماتے تھے !!

وہاں ابن ابی العوجاء جیسے افراد بھی موجود تھے جو زندیقیت و دہریت
یعنی وجود خدا سے انکار کا درس دیا کرتے تھے اور اس پر استدلال بھی
پیش کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب امام جعفر صادق علیہ السلام کے
بیانات کا ہم جائزہ لیتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ حضرتؑ توحید و نبوت یا اسی کے مثل
دوسرے مسائل باقاعدہ استدلال کے ساتھ بیان فرماتے ہیں: ظاہر ہے، دشمن
کے استدلال کے خلاف استدلال کی ہی ضرورت ہوتی ہے۔ جبکہ امام
زین العابدین علیہ السلام کے بیانات میں یہ چیز نہیں ملتی۔ حضرت
اسلامی مطالب پیش کرتے وقت منطقی استدلال عوام کے سامنے پیش
نہیں کرتے۔ بلکہ صرف تذکر و یاد دہانی کے طور پر اشارہ کر دیتے ہیں "
دیکھو! قبر میں تم سے توحید و نبوت کے سلسلے میں سوالات کئے جائیں گے
آپ نے ملاحظہ فرمایا یہ صرف ذہن کو ایک ٹھوکا دینے کے لئے ہے کہ انسان
ان مسائل پر سوچنے کے لئے مجبور ہو جائے اور وہ چیز جو غفلت و فراموش

کی نذر ہو چکی ہے ذہن دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہو جائے۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ امام سجاد علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دور میں کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جو اس بات پر دلالت کرے کہ لوگ حتیٰ کہ ارباب حکومت وسلطنت بھی، اسلامی فکر و نظر سے کھل کر بغاوت و برگشتگی پر آمادہ ہوں ہاں صرف ایک موقع مجھے نظر آیا اور اس کا اظہار یزید کے اس شعر سے ہوتا ہے جو اس نے غرور و مستی میں ڈوب کر اس وقت پڑھا تھا جب خانوادۂ رسولؐ کو اسیر کر کے اس کے دربار میں پیش کیا گیا ــــ وہ کہتا ہے:

لعبت ھاشم بالملک فلا خبر جاء ولا وحی نزل

(معاذاللہ) بنی ہاشم نے حکومت وسلطنت کے لئے ایک کھیل کھیلا تھا نہ کوئی خبر آئی نہ کوئی وحی نازل ہوئی یعنی اس کو دین و وحی سے کوئی مطلب نہ تھا ــــ چنانچہ اس مسئلہ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یزید کی یہ ہرزہ سرائی ممکن ہے نشہ و مستی کے سبب رہی ہے ــــ ورنہ حتیٰ کہ عبدالملک اور حجاج بن یوسف جیسوں میں بھی عقیدۂ توحید یا عقیدۂ نبوت سے کھل کر مخالفت کرنے کی جرأت نہ تھی۔ عبدالملک بن مروان وہ شخص ہے جو اس کثرت سے قرآن کی تلاوت کیا کرتا تھا کہ اس کو لوگ قراء قرآن میں شمار کرتے تھے۔ چنانچہ کہتے ہیں جس وقت اس کو خبر دی گئی کہ تم

خلیفہ ہو گئے اور حکومت پر فائز ہوئے تو اس نے قرآن کو بوسہ دیا اور کہا:
ھٰذا فراق بینی و بینک یعنی اب ہماری اور تمہاری ملاقات
قیامت میں ہوگی۔ حقیقت بھی یہی تھی پھر اس کے بعد اس نے کبھی قرآن
اٹھا کر نہ دیکھا۔

حجاج بن یوسف کیسا ظالم تھا آپ نے سنا ہی ہوگا لیکن یقیناً جتنا آپ نے
سنا ہے وہ اس کے مظالم سے کہیں کم ہے۔ اس کے جیسا شخص جب بھی منبر
سے خطبہ دیتا ہے تو لوگوں کو تقوائے الٰہی کی تلقین کرتا نظر آتا ہے۔ چنانچہ جناب
امام سجادؑ کی زندگی میں جو کچھ ملتا ہے اس کا ماحصل عوام کو اسلامی افکار
و نظریات کی طرف متوجہ اور خبر دار کرنا ہے تاکہ لوگوں کے فکری بہاؤ کو مادیت
کے بجائے خدا، اس کے دین اور قرآن کی طرف موڑ دیا جائے۔

دوسرا قابل توجہ نکتہ وہی ہے جس کی طرف ہم پہلے بھی اشارہ کر
چکے ہیں کہ امام علیہ السلام ان عمومی خطابات میں یکایک بالکل غیر محسوس
طور پر روئے سخن مسئلہ امامت کی طرف موڑ دیتے ہیں یعنی دیگر مسائل
اسلامی کے درمیان اس کا ویسے ہی ذکر کر دیتے ہیں جیسے کہ انقلاب
ایران سے قبل گزشتہ شاہی دور میں کوئی عوام سے خطاب کرتے
ہوئے کہہ دیا کرتا تھا کہ لوگو! خدا کو یاد کرو، مسئلۂ توحید کو سمجھنے کی
کوشش کرو، مسئلہ نبوت پر غور و فکر سے کام لو، مسئلۂ حکومت پر

توجہ کرو ...... آپ دیکھئے قیادت ورہبری کا جو انداز ہم کو یہاں نظر آتا ہے ۔ اسی کی روشنی میں امام سجاد کا بیان سمجھ سکتے ہیں۔ جس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ شاہی دور میں یہی لفظ حکومت زبان پر جاری کرنا کتنا خطرناک تھا اگر اگر کوئی عوام سے مسئلۂ حکومت پر توجہ صرف کرنے کی بات کرتا تو حکومت آسانی سے اس کو نظر انداز نہیں کر سکتی تھی لیکن جب یہی بات موعظ کے لب لہجہ میں کسی عابد و زاہد کی زبان سے کی جاتی تو ارباب حکومت کیلئے کسی حد تک قابل قبول ہو جاتی تھی ۔ یعنی یہ چیز اتنی زیادہ حساسیت انگیز نہیں ہے ۔

ہم فکر جماعت کی تشکیل

بہرحال، یہ امام علیہ السلام کے بیانات کی ایک قسم تھی ۔ دوسری قسم کے بیانات وہ ہیں جن میں امام زین العابدین علیہ السلام کے مخاطب کچھ مخصوص افراد ہیں اگر چہ یہ مشخص نہیں ہے کہ یہ کن لوگوں سے خطاب ہے لیکن یہ کاملاً طے ہے کہ آپ کا خطاب ایک ایسے گروہ سے ہے جو موجودہ حکومت سے بیزار اور اس کا مخالف ہے چاہے وہ جو لوگ بھی ہوں ۔ اور شاید یہ کہنا بھی غلط نہ ہو کہ یہ وہی گروہ ہے جو امامؑ کی اطاعت اور حکومت اہلبیت پر یقین و اعتقاد رکھتا ہے ۔

کتاب "تحف العقول" میں خوش قسمتی سے امام علیہ السلام

کے اس قسم کے بیانات کا ایک نمونہ موجود ہے (ایک نمونہ اس لئے کہ جب ہم اس طرح کی دوسری کتابوں کی چھان بین کرتے ہیں تو ان میں بھی ایسے چند نمونوں کے سوا امام زین العابدین علیہ السلام سے منقول کوئی اور چیز نہیں ملتی) پھر بھی انسان یہ محسوس کرسکتا ہے کہ امام سجادؑ کی زندگی میں اس طرح کے بے انتہا نمونے پیش آئے ہوں گے مگر موجودہ حالات اور آپ کی حیات کے دوران پیش آنے والے طرح طرح کے حوادث، گھٹن کی زندگی، دشمنوں کے حملے، اذیتیں، اصحاب ائمہ کا قتل اور شہادت یہ سب اس بات کا باعث بنے کہ وہ گراں بہا آثار باقی نہ رہ سکے چنانچہ بہت ہی کم مقدار میں چیزیں ہمارے ہاتھ لگ سکی ہیں۔

بہرحال امام علیہ السلام کا یہ بیان کچھ اس طرح شروع ہوتا ہے:۔

"کفانا اللّٰہ وایاکم کید الظالمین وبغی الحاسدین وبطش الجبارین"

خداوند عالم ہم کو اور تم کو ظالموں کے کید و فریب حاسدوں کی بغاوت وسرکشی اور جابروں کی جبر و زیادتی سے محفوظ و مامون رکھے۔

خود خطاب کا انداز بتاتا ہے کہ امام علیہ السلام اور آپ کا مخاطب گروہ دونوں اس جہت میں شریک ہیں یعنی موجودہ حکومت و نظام کی طرف سے وہ سب کے سب خطرہ میں ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ بات ایک

مخصوص گروہ سے تعلق رکھتی ہے اور اس جماعت کو لفظ مومنین یا اہلبیت کے محبین و مقربین سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اس انداز کے خطابات "یا ایھا المومنون" سے شروع ہوتے ہیں جبکہ پہلی نوعیت کے بیانات میں ایھا الناس، یا بعض موارد میں " یا ابن آدم" سے خطاب کیا گیا ہے اور یہاں ایھا المومنون ہے۔ یعنی امام علیہ السلام کے خطاب میں اپنے مخاطبین کے صاحب ایمان ہونے کا اعتراف موجود ہے اور یہ وہ مومنین ہیں جو اہلبیت علیہم السلام اور ان کے افکار و نظریات پر واقعی ایمان رکھتے تھے۔

اس منزل میں جب امام علیہ السلام اپنے اصل مطلب پہ آتے ہیں تو آپ کی گفتگو بھی اس چیز کی واضح نشان دہی کرتی ہے کہ آپ کے مخاطب مومنین ـ یعنی اہلبیت علیہم السلام سے قربت رکھنے والے افراد ہیں۔

لا یفتننکم الطواغیت واتباعھم من اھل الرغبة فی الدنیا المائلون الیھا، المفتنون بھا، المقبلون علیھا"

یہ طاغوتی افراد اور ان کے مطیع و فرمانبردار ـ جو دنیا کے حریص، اس کے شیدائی، اس پر فریفتہ و قربان اور اس کی طرف دوڑنیوالے

لوگوں میں سے ہیں تم کو فریب میں مبتلا نہ کردیں۔"

یہاں ــــ مومنین سے خطاب کے وقت اصل لب ولہجہ میں انکے
شر سے محفوظ رہنے اور آئندہ ہم فکری کے ساتھ کام کرنے کے لئے آمادہ
کیا جارہا ہے۔ ظاہر ہے موجودہ طاغوتی نظام کے طرفداروں اور ائمہ کے
ہمنواؤں کے درمیان اندر اندر جو شدید مخالفت اور مقابلہ آرائی جاری
تھی اس کی وجہ سے ائمہ علیہم السلام کے چاہنے والوں کو بڑی سخت محرومیت
اور رنج ومصیبت جھیلنی پڑ رہی تھی۔ بالکل وہی صورتحال جن سے انقلابی
جدوجہد کے دوران ہم خود دوچار رہے ہیں۔ وہ لوگ جو اس انقلاب
کی کامیابی سے پہلے انقلابی سرگرمیوں میں شریک تھے ان کو فطری طور پر
وہ آسائشیں میسر نہیں تھیں جو اس جدوجہد سے کنارہ کش رہنے
والوں کو حاصل تھیں اس کے برخلاف انقلابیوں کو ہر وقت قید وبند،
زدوکوب، جلاوطنی اور خوف وہراس یا ملک سے فرار کا مرحلہ درپیش
تھا۔ اگر اس کا تعلق تجارت وصنعت سے ہوتا تو اس کے سامنے
ٹیکسوں کا انبار لگا رہتا اور جتنا اس کو ادا کرنا چاہئے اس سے کہیں زیادہ
دینا پڑتا۔ اگر کسی کالج یا یونیورسٹی کا طالب علم ہوتا تو اس کی سرگرمیوں
پر سخت نظر رکھی جاتی کوئی نہ کوئی پیچھے لگا رہتا اور نتیجہ کے طور پر خارجہ
اس کا مقدر بن جاتا۔ کسی دینی مدرسہ یا حوزۂ علمیہ کا طالب علم

ہوتا تو اس کو فرار کی زندگی گزارنی پڑتی ورنہ قید و بند، ہر وقت کی پوچھ گچھ اور جلاوطنی کا سامنا کرنا پڑتا۔ کسی آفس سے وابستہ ہوتا تو ہر گھڑی معزولی معطلی یا اسی قسم کی کسی بھی سزا کے لئے تیار رہنا پڑتا۔ مختصر یہ کہ کسی بھی طبقہ یا گروہ سے تعلق رکھنے والا اگر انقلابی جدوجہد سے وابستہ پایا جاتا تو بہر حال گزشتہ شاہی حکومت میں اس کی زندگی مادی اعتبار سے کسی نہ کسی پریشانی اور الجھن کا شکار رہتی۔ حتیٰ کہ وہ افراد جو انقلاب سے محبت رکھتے تھے یا اس میں کسی طرح کا حصہ لیتے تھے ــ مثال کے طور پر ــ حج کے لئے جانے سے محروم کر دیئے جاتے تھے جبکہ مکہ جانا اس وقت محض ایک عبادی عمل سمجھا جاتا تھا لیکن اس وقت کی حکومت سے ہر داآزما کسی بھی فرد کو یا تو مکہ جانے کی اجازت ہی نہ ملتی تھی یا بڑی زحمتوں کے بعد ملتی تھی۔ اسی طرح سے دوسرے قسم کے سفروں میں بھی دقت و دشواری کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

اور یہ ایک فطری سی بات ہے کہ جو لوگ میدان جہاد میں اترتے ہیں انھیں زندگی کی صعوبتوں اور پریشانیوں کا بہر حال سامنا کرنا پڑتا ہے جبکہ ان کے مقابلہ میں دوسرے افراد کو آسائش اور سہولتیں حاصل رہتی ہیں۔ انقلابیوں کے سامنے ایک بہت بڑا خطرہ یہ درپیش رہتا ہے کہ دوسروں کو دی جانے والی سہولتیں ان کو بھی اپنی طرف کھینچی

رہتی ہیں اور ان سہولتوں کے بہرہ ور ہونے کی قیمت اس مقدس جدوجہد سے ہاتھ دھونے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتی۔

چنانچہ امام علیہ السلام کے اس بیان میں اسی نکتہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے مومنین کو اس بات سے خبردار کیا گیا ہے کہ اس دنیا کی وقتی ترک بھڑک اور جھوٹی نمائش کے چکر میں اگر آگئے تو اس کی قیمت کے طور پر تم کو اہل طاغوت سے ہاتھ ملانا پڑے گا۔ اور یہ انداز اور لب ولہجہ نہ صرف اس بیان میں بلکہ امام علیہ السلام سے منقول اور بھی بہت سے دوسرے مختصر اقوال و روایات میں آپ مشاہدہ فرما سکتے ہیں۔ اگر آپ ان کو دیکھیں تو محسوس کریں گے کہ امامؑ نے لوگوں کو دنیا سے پرہیز کی دعوت دی ہے۔

دنیا سے پرہیز کا کیا مطلب ہے؟ یعنی لوگوں کو اس لہر سے محفوظ رکھیں جو انسان کو ناز و نعم میں غرق کر دیتی ہے اور اس کے دام میں گرفتار ہو کر انسان اپنے ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے اور اس کی انقلابی جدوجہد سرد پڑ جاتی ہے۔ اور یہ دعوت مومنین سے متعلق خطابات میں ملتی ہے عوام الناس سے خطاب کے دوران یہ انداز بہت کم نظر آتا ہے۔

عوام سے خطاب کے وقت، جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں، زیادہ تر جو لب ولہجہ اپنایا گیا ہے وہ یہی ہے کہ: لوگو! خدا کی طرف متوجہ رہو، قبر و قیامت کا دھیان رکھو، اپنے کو کل کے لئے آمادہ کر دیا اسی طرح کی

دوسری باتیں۔

ان حقائق کی روشنی میں اگر کوئی سوال کرے کہ اس دوسرے قسم کے خطابات سے امام علیہ السلام کا مقصد کیا تھا ؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ امام ایک ہم فکر جماعت تیار کرنا چاہتے ہیں امامؑ چاہتے ہیں کہ کسی ضروری موقع کے لئے مومنین کا ایک گروہ آمادہ رہے یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کو اعلیٰ اقتدار کی ہوس اور جھوٹی مراعات کی چکاچوند سے محفوظ رکھیں اس دوسرے قسم کے بیان میں امامؑ بار بار موجودہ حاکم نظام کا تذکرہ کرتے ہیں جبکہ گزشتہ قسم کے بیان میں یہ چیز اتنی وضاحت کے ساتھ نظر نہیں آتی ۔ یہاں امام سجادؑ بڑے ہی سخت لب ولہجہ میں حکومتی مشینری کو مورد ملامت قرار دیتے ہوئے اس کو شیطان کا ہم پلّہ بتاتے ہیں مثال کے طور پر فرماتے ہیں :۔

وان الامور الواردة علیکم فی کل یوم ولیلة من مظلمات الفتن وحوادث البدع وسنن الجور بوالق الزمان"

تم لوگ جن امور سے ہر شب و روز دوچار رہتے ہو (یعنی) یہ ظلمت خیز فتنے ، نئی نئی بدعتیں ــ وہ بدعتیں جو ظالم نظام کی اختراع ہیں ظلم وجور پر مبنی سنتیں اور زمانہ بھر کی سختیاں ــ

" وهیبة السلطان" یہ سلطنت کا خوف وہراس۔

"وسوسۃ الشیطان" اور شیطانی وسوسے۔

یہاں امامؑ ذکر سلطان کے فوراً بعد وسوسۂ شیطان کا ذکر کرتے ہیں یعنی پوری صراحت کے ساتھ حاکم وقت کا ذکر کرتے ہیں اور اس کو شیطان کا دست راست قرار دیتے ہیں۔ گفتگو کے آخر میں امامؑ ایک نہایت ہی عمدہ جملہ ارشاد فرماتے ہیں چونکہ یہ جملہ بڑی اہمیت کا حامل ہے لہٰذا ہم اسے یہاں نقل کر دینا چاہتے ہیں یہ جملہ اسی مطلب کی نشاندہی کرتا ہے جسکی طرف ابھی ہم اشارہ کر چکے ہیں۔

"لتثبط القلوب عن نیتھا"

یہ حوادث جو انسانی زندگی میں شب و روز پیش آتے ہیں خصوصاً ایسے گھٹن کے ماحول میں — دلوں کو ان کی نیت اور جہت سے موڑ دیتے ہیں۔ جہاد کے شوق اور اس کے محرکات کو ختم کر دیتے ہیں۔

"وتذھلھا عن موجود الھدیٰ"

موجودہ ہدایت کو یعنی وہ ہدایت جو موجودہ معاشرہ میں پائی جاتی ہے اس کی طرف سے ذہنوں کو غافل و برگشتہ کر دیتے ہیں۔

"ومعرفۃ اھل الحق"

اور (انسان) اہل حق کی معرفت سلب کر کے فراموشی میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ اور اہل حق کی یاد کو ان کے دلوں میں باقی نہیں رہنے دیتے۔

امام سجادؑ کے اس پورے بیان میں وہی اسلوب و انداز پایا جاتا ہے جس کا ہم نے شروع میں ذکر کیا ہے یعنی لوگوں کے موعظہ و نصیحت کے انداز میں خبردار کر رہے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس طرح کے حوادث زندگی ان کو ان کی مجاہدانہ روش سے غافل بنا دیں اور انھیں ان کے راستہ سے منحرف کر دیں اور دل و دماغ اس کی یاد سے خالی ہو جائے ــــــ امام علیہ السلام کے ایسے متعدد بیانات ملتے ہیں جن میں سلطان و حاکم جور کا ذکر کیا گیا ہے۔

ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرماتے ہیں :۔

وایاکم وصحبۃ العاصین ومعونۃ الظالمین

ایسا نہ ہو کہ تم لوگ گناہ گاروں کی ہمنشینی اختیار کر لو اور ستمگروں کی مدد کرنے لگو۔ یہاں گناہ گاروں سے مراد کون لوگ ہیں جو عبدالملک کے ظالمانہ نظام کا جزو بن چکے ہیں امامؑ ان کی ہم نشینی سے منع کر رہے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم لوگ ظالموں کی مدد کا ذریعہ بن جاؤ۔

اب ان حقائق کی روشنی میں جناب امام سجادؑ کی تصویر پردۂ تخیل پر اتار کر دیکھئے کہ حضرتؑ کی کیسی شخصیت آپ کے ذہن میں ابھر کر سامنے آتی ہے آیا اب بھی وہی مظلوم و بے زبان کمزور و بیمار امام جو امور زندگانی سے کوئی مطلب نہیں رکھتا آپ کے ذہن میں آتا ہے ؟! امام علیہ السلام

اپنے کچھ مومن دوستوں، طرفداروں اور بہی خواہوں کو ایک جگہ جمع کرتے ہیں اور موجودہ حالات میں ان کو ظالم حکام اور ان کے درباریوں کی قربت و ہم نشینی نیز اپنی مقدس مہم اور جد و جہد سے غافل و بے پرواہ ہونے سے سختی کے ساتھ منع کرتے ہیں اور ان کو اجازت نہیں دیتے کہ وہ اپنی مجاہدانہ سرگرمیوں سے منحرف ہو جائیں۔ امام ان کے ایمانی جذبات کو تر و تازہ اور زندہ و باقی رکھنا چاہتے ہیں تاکہ ایک روز ان کا وجود اسلامی حکومت کے قیام کی راہ میں موثر ثابت ہو سکے۔

فلسفۂ امامت امامؑ کی نظر میں :۔

منجملہ ان تمام چیزوں کے جو امام علیہ السلام کے بیانات کے اس حصہ میں مجھے نہایت ہی اہم اور قابل توجہ نظر آئیں حضرت کے وہ ارشادات بھی ہیں جن میں اہلبیت علیہم السلام سے وابستہ افراد کے گزشتہ تجربات کا آپ نے ذکر فرمایا ہے ___ بیان کے اس حصہ میں جناب امام سجادؑ لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں: کیا تم لوگوں کو یاد ہے (یا تم کو اس بات کی خبر ہے) کہ گزشتہ ادوار میں ظالم و جابر حکمرانوں نے تم پر کیا کیا زیادتیاں کی ہیں ___ یہاں ان مصیبتوں اور زیادتیوں کی طرف اشارہ مقصود ہے جو محبان اہلبیتؑ کو معاویہ، یزید اور مروان وغیرہ کے ہاتھوں اٹھانی پڑی ہیں چنانچہ امام علیہ السلام کا اشارہ واقعۂ

کربلا، واقعۂ حرہ، حجر بن عدی اور رشید ہجری وغیرہ کی شہادت نیز ایسے بہت سے مشہور و معروف، اہم ترین حادثوں کی طرف ہے جس کا اہلبیتؑ کے مطیع و ہم نوا افراد گزشتہ زمانوں میں ایک طویل مدت سے تجربہ کرتے چلے آرہے تھے اور وہ واقعات ان کے ذہنوں میں ابھی موجود تھے۔ امام چاہتے ہیں کہ گزشتہ تجربات اور تلخ ترین یادوں کو تازہ کرکے لوگوں کے مجاہدانہ عزم و ارادہ میں مزید پختگی پیدا کریں۔ مندرجہ ذیل عبارت پر ذرا توجہ فرمائیے:۔

"فقد لعمری استدبرتم من الامور الماضية فی الایام الخالية من الفتن المتراكمة والانهماك فيها ما تستدلون به علی تجنب الغواة و...."

"میری جان کی قسم، وہ گزشتہ واقعات جو کہ تمہاری آنکھوں کے سامنے گزر چکے ہیں۔ فتنوں کا ایک لامتناہی سلسلہ جس میں ایک دنیا غرق نظر آتی تھی تم لوگوں کو ان حوادثات و تجربات سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ اور ان کو اپنے لئے درس و استدلال بناتے ہوئے زمین پر فساد برپا کرنے والے گمراہ اور بدعتی افراد سے دوری و اجتناب کرلینا چاہیئے۔"

یعنی تمھیں اس بات کا بخوبی تجربہ حاصل ہے کہ اہل بغی و فساد

یعنی یہی حکام جور، جب تسلط حاصل کرلیں گے تو تمہارے ساتھ کس طرح پیش آئیں گے۔ گزشتہ تجربات کی روشنی میں تم جانتے ہو کہ تمہیں ان لوگوں سے دور رہنا چاہئے، اور ان کے مقابلہ میں صف آرائی کرنی چاہیے"

امام علیہ السلام نے اپنے بیان میں مسئلہ امامت کو بڑی صراحت کے ساتھ پیش کردیا ہے، مسئلہ امامت یعنی یہی خلافت و ولایت، مسلمانوں پر حکومت کرنے اور نظام اسلامی نافذ کرنے کا مسئلہ ہے۔ یہاں امام سجادؑ مسئلہ امامت کتنے واضح انداز سے بیان کرتے ہیں جبکہ اس وقت کے حالات ایسے تھے کہ اس قسم کے مسائل اس صراحت کے ساتھ عوام میں پیش نہیں کئے جاسکتے تھے امامؑ فرماتے ہیں:۔

"فقدموا امر اللّٰہ وطاعتہ وطاعۃ من اوجب اللّٰہ طاعتہ"

فرمان الٰہی اور اطاعت رب کو مقدم سمجھو اور اس کی اطاعت و پیروی اختیار کرو جس کی اطاعت و پیروی خدا نے واجب قرار دی ہے۔

امام علیہ السلام نے اس منزل میں امامت کی بنیاد اور فلسفہ کو شیعی نقطۂ نظر سے پیش کیا ہے۔ خدا کے بعد وہ کون سے لوگ ہیں

جن کی اطاعت کی جانی چاہیئے ؟ وہ، جن کی اطاعت خدا نے واجب قرار دی ہے۔ اگر لوگ اس وقت اس مسئلہ پر غور وفکر سے کام لیتے تو بڑی آسانی سے یہ نتیجہ نکال سکتے تھے کہ عبدالملک کی اطاعت واجب نہیں ہے کیونکہ خدا کی طرف سے عبدالملک کی اطاعت واجب کئے جانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، عبدالملک کا اپنے تمام ظلم وجور اور بغی وفساد کی وجہ سے لائق اطاعت نہ ہوتا ظاہر ہے ـــ یہاں پہلے تو امام علیہ السلام مسئلہ امامت بیان فرماتے ہیں اس کے بعد پھر ایک شبہ جو مخاطب کے ذہن میں باقی رہ جاتا ہے اس کا بھی ازالہ فرماتے ہوئے کہتے ہیں :۔

ولا تقدموا الامور الواردۃ علیکم من طاعۃ الطواغیت وفتنۃ زھرۃ الدنیا بین یدی امر اللہ وطاعتہ وطاعۃ اولی الامر منکم۔

اور جو کچھ تم پر طاغوتوں ـــ عبدالملک وغیرہ ـــ کی طرف سے عائد کیا جاتا ہے اس کو خدا کی اطاعت کے زمرہ میں رکھتے ہوئے خدا کی اطاعت اس کے رسول کی اطاعت اور اولی الامر کی اطاعت پر مقدم قرار نہ دو ـــ اصل میں امامؑ نے اپنے بیان کے اس ٹکڑے میں بھی مسئلہ امامت بڑی صراحت کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔

حضرت نے گزشتہ بیان میں بھی دو بنیادی اور اساسی مسائل پر توجہ دلائی ہے چنانچہ دونوں بیانات میں مذکورہ تین مراحل تبلیغ میں سے دوم مرحلے یعنی لوگوں کے اسلامی افکار و عقائد کی یاددہانی تاکہ لوگ عقائد اسلامی کا پاس و لحاظ کریں اور ان میں دینداری کا شوق پیدا ہو سکے ــــ اور اس کے بعد دوسرا مسئلہ "ولایت امر" یعنی نظام اسلامی میں حکومت و قیادت کا استحقاق واضح کرنا ہے۔ امام علیہ السلام اس وقت لوگوں میں ان دونوں مسائل کو بیان کرتے ہیں، اور درحقیقت اپنے مدنظر نظام علوی یعنی اسلامی و الٰہی نظام کی تبلیغ کرتے ہیں۔

تنظیم کی ضرورت

امام کے یہاں ایک تیسری نوعیت کے حامل بیانات بھی ملتے ہیں جو ان دونوں سے بھی زیادہ توجہ کے مستحق ہیں ان بیانات میں حضرت کھلے طور پر لوگوں کو ایک اسلامی تنظیم کی تشکیل کی طرف متوجہ کرتے ہیں البتہ یہ بات ان ہی لوگوں کے درمیان ہوئی ہے جن کو عوام کا اعتماد حاصل رہا ہے ورنہ اگر عام لوگوں کو اس قسم کی کسی جماعت کی تشکیل کی دعوت دی گئی ہوتی تو اس کا پردۂ راز میں رہنا مشکل ہو جاتا اور حضرت کے لئے بڑی زحمت اور پریشانی کا سبب بن جاتا ــــ خوش قسمتی سے

"تحف العقول" میں اس نوعیت کے بیانات کا بھی ایک نمونہ موجود ہے جسے ہم یہاں نقل کر رہے ہیں۔ امام کا بیان یوں شروع ہوتا ہے:-

ان علامۃ الزاھدین فی الدنیا الراغبین فی الآخرۃ ترکھم کل خلیط وخلیل ورفضھم کل صاحب لا یرید ما یریدون

دنیا کے وہ زاہدین جو دنیا کے پیچھے نہیں بھاگتے اور اپنی دلچسپی آخرت پر مرکوز رکھتے ہیں ان کی پہچان اور علامت یہ ہے کہ ان کے جو دوست اور ساتھی ہم فکر و ہم عقیدہ بلکہ ہم دل اور ہم مشرب نہیں ہوتے ان کو ترک کر دیتے ہیں۔ کیا یہ واضح طور پر ایک شیعی تنظیم کے تشکیل کی دعوت نہیں ہے؟!

اس بیان سے لوگوں کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ لوگ جو ان کے مطالبات وخیالات سے اتفاق نہیں رکھتے اور جن کے احساس وجذبات بالکل مختلف ہیں جو حکومت حق یعنی علوی نظام نہیں چاہتے، وہ ان سے کنارہ کش ہو کر ان کے لئے اجنبی اور بیگانہ بن جائیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے یہاں آمد و رفت اور تعلقات ختم کر لیں لیکن یہ تعلقات ویسے ہی ہوں جیسے کہ انقلاب ایران سے قبل انقلابیوں اور دوسرے ایرانیوں کے درمیان پائے جاتے تھے۔ یعنی ان سے ملیں لیکن احتیاط

کے ساتھ جیسا کہ لوگ اس طرح کے دکانداروں کو پہچان لیتے تھے کہ یہ سارا
کی ہے یا فلاں آفیسر لوگوں کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے کیلئے مامور کیا گیا ہے۔
امام فرماتے ہیں: وہ لوگ جو تمہاری فکر و عزائم سے متفق نہ ہوں یا
ھدف و مقصد سے ہم آہنگی نہ رکھتے ہوں ان کے ساتھ تمہارے معاملات
اور آمد و رفت کسی اجنبی اور بیگانے کے مانند ہونی چاہیے' ان سے دوستانہ
تعلقات ختم کر دینا چاہیے۔

میں سمجھتا ہوں اس طرح کے مزید بیانات خود امام سجاد علیہ السلام
کے یہاں نیز دیگر ائمہ علیہم السلام کے یہاں بھی مل جائیں گے بلکہ دیگر ائمہ
کے ارشادات میں یہ چیز زیادہ مل جائے گی جہاں تک خود میری نظر ہے
اس طرح کے بیانات امام جعفر صادق علیہ السلام اور امام محمد باقر علیہ السلام
نیز ان کے بعد کے کم از کم تین چار ائمہ کے یہاں مجھے ملے ہیں حتی کہ امیرالمومنین
علیہ الصلواۃ والسلام کے فرمودات میں بھی منظم و مرتب اسلامی
جماعت کی تشکیل کی طرف اشارے موجود ہیں، البتہ یہاں تفصیل
طلب موضوع پر زیادہ بحث کی گنجائش نہیں ہے۔

امام زین العابدین علیہ السلام کے کچھ بیانات وارشادات ایسے
بھی ہیں جن میں پیش کئے جانے والے مطالب کلی نوعیت کے حامل ہیں
ان میں ان مخصوص پہلوؤں کو مورد بحث نہیں قرار دیا گیا ہے جن کی

ہم نے اشارہ کیا ہے۔ مثال کے طور پر امام سجادؑ کا ایک رسالہ حقوق سے متعلق ہے جو دراصل آپ کا ایک نہایت ہی مفصل خط ہے اور ہماری اصطلاح میں اس کو ایک مستقل رسالہ کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے، جی ہاں! یہ کتاب جو رسالہ حقوق کے نام سے مشہور ہے حضرت کا ایک خط ہے جو آپ نے اپنے کسی محب کو لکھا ہے اور اس میں ایک دوسرے کے تئیں انسانی حقوق و ذمہ داری کا ذکر فرمایا ہے، یقیناً یہ ایک رسالہ سے کم نہیں ہے۔ امام علیہ السلام نے اس خط میں مختلف جہتوں سے لوگوں کے ایک دوسرے پر کیا حقوق ہیں ان کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔ مثلاً خدا کے حقوق، اعضاء و جوارح کے حقوق، کان کے حقوق، آنکھ کے حقوق، زبان کے حقوق، ہاتھ کے حقوق وغیرہ اسی طرح اسلامی معاشرہ پر حاکم فرمانروا کے عوام پر کیا حقوق ہیں، عوام کے حاکم پر کیا حقوق ہیں، دوستوں کے حقوق، پڑوسیوں کے حقوق، اہل خاندان کے حقوق ـــــ اور ان تمام حقوق کا اس عنوان سے ذکر کیا گیا ہے جس کا ایک اسلامی نظام میں زندگی بسر کرنے والے شخص کو پاس و لحاظ رکھنا ضروری ہے گویا امام علیہ السلام نے بڑے ہی نرم انداز میں حکومت سے مقابلہ آرائی یا آئندہ نظام کا حوالہ دیئے بغیر مستقبل میں قائم کئے جانے والے نظام کی بنیادوں کو بیان کر دیا ہے کہ

اگر ایک روز خود امام سجاد علیہ السلام کے زمانۂ حیات میں (جس کا اگرچہ احتمال نہیں پایا جاتا تھا) یا آپ کے بعد آنے والے زمانہ میں اسلامی نظام حکومت قائم ہو جائے تو مسلمانوں کے ذہن ایک دوسرے کے تئیں عائد ہونے والی ذمہ داریوں سے پہلے سے مانوس رہیں۔ دوسرے لفظوں میں لوگوں کو آئندہ متوقع اسلامی حکومت کے اسلام سے آشنا بنا دینا چاہتے ہیں۔ یہ بھی امام علیہ السلام کے بیانات کی ایک قسم ہے جو بہت ہی زیادہ قابل توجہ ہے۔

ایک قسم وہ بھی ہے جس کا آپ صحیفۂ سجادیہ میں مشاہدہ فرماتے ہیں ظاہر ہے صحیفۂ سجادیہ سے متعلق کسی بحث کے لئے بڑی تفصیل و تشریح کی ضرورت ہے۔ مناسب یہی ہے کہ کوئی اس کتاب پر باقاعدہ کام کریں۔ صحیفۂ سجادیہ دعاؤں کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس میں ان تمام موضوعات کو مورد سخن قرار دیا گیا ہے جن کی طرف بیدار و ہوشمند زندگی میں انسان متوجہ ہوتا ہے ان دعاؤں میں زیادہ تر انسان کے قلبی روابط اور معنوی ارتباطات پر تکیہ کیا گیا ہے اس میں بے شمار مناجاتیں اور دعائیں مختلف انداز سے معنوی ارتقا کی خواہش و آرزو سے مملو ہیں۔ امام علیہ السلام ان دعاؤں کے ضمن میں دعاؤں کی ہی زبان سے لوگوں کے ذہنوں میں اسلامی زندگی کا ذوق و شعور بیدار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

دعا کے ذریعہ جو فائدے اٹھائے جا سکتے ہیں ان میں ایک وہ بھی ہے جسے میں بارہا ذکر کر چکا ہوں کہ دعا لوگوں کے قلوب میں ایک صحیح و سالم محرک و رجحان بیدار کر دیتی ہے جس وقت آپ کہتے ہیں :-

اللّٰھم اجعل عواقب امورنا خیرا

"خدایا ہمارا انجام بخیر فرما"

ظاہر ہے آپکے دل میں اس وقت انجام کار کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور آپ عاقبت کی فکر میں لگ جاتے ہیں بعض وقت انسان اپنی عاقبت سے غافل رہ جاتا ہے اپنے حال میں مست زندگی گزارتا رہتا ہے اور اس بات کی فکر نہیں کرتا کہ عاقبت کا تصور انسانی سرنوشت کے تعین میں بہت ہی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ جب دعا کے لئے ہاتھ بلند کئے یک بیک ذہن اس طرف متوجہ ہوا اور انجام کار پر نظر رکھنے کا جذبہ بیدار ہو گیا۔ اور پھر آپ اس فکر میں پڑ گئے کہ ایسے امور انجام دیں جو آپ کی عاقبت بہتر بنا سکیں۔ ویسے اس کو کس طرح بہتر بنایا جا سکتا ہے یہ ایک دوسری بحث ہے۔ میں تو اس مثال کے ذریعے صرف اس بات کی طرف متوجہ کرنا چاہتا تھا کہ دعا کس طرح انسان کے اندر ایک صحیح اور سچا جذبہ بیدار کر دیتی ہے۔ صحیفۂ سجادیہ ایک ایسی کتاب ہے جو شروع سے آخر تک دعاؤں کے جامہ میں ایسے ہی

اعلیٰ جذبات و افکار سے معمور ہے جن پر انسان اگر غور کرے تو صرف یہی صحیفۂ سجادیہ ایک معاشرہ کی اصلاح اور بیداری کے لئے کافی ہے۔

فی الحال اس بحث کو ہم یہیں ختم کرتے ہیں البتہ اس کے علاوہ بھی ایسی بہت سی چھوٹی چھوٹی روایتیں ہیں جو امام زین العابدین علیہ السلام سے نقل ہوئی ہیں جس کا ایک نمونہ ہم گزشتہ بحث کے ذیل میں پیش کر چکے ہیں۔ امام فرماتے ہیں:۔

"اولاحر یدع ھٰذہ اللماظۃ لاھلھا"

"لماظۃ" یعنی کتے کا بچا ہوا کھانا، ملاحظہ فرمائیے امامؑ کا یہ بیان کتنا اہم ہے — آیا ایک حریت پسند ایسا نہیں ہے جو کتے کی بچی ہوئی غذا کا کیا مطلب ہے؟ یہی دنیوی آرائش، اونچے اونچے محل، شان و شوکت اور ترک بھڑک — وہ چیزیں جن کی طرف تمام کمزور دل افراد عبدالملک کے دور میں کھنچے چلے جا رہے تھے۔ اسی چیز کو امامؑ نے لفظ "لماظۃ" سے تعبیر کیا ہے۔ وہ تمام لوگ جو عبدالملک کی غلامی یا اس کے غلاموں کی غلامی میں مشغول تھے یا جو کچھ بھی ان لوگوں کے ہاتھوں ہو رہا تھا اس سے راضی تھے۔ ان سب کا مقصد یہی کتے کی بچی ہوئی غذا کا حاصل کرنا تھا امام علیہ السلام اسی لئے فرماتے ہیں کہ کتے کی بچی ہوئی غذا کے پیچھے نہ بھاگتے پھرو تاکہ مومنین کرام عبدالملک

کے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس کر اس کی طرف جذب نہ ہونے پائیں۔
اس طرح کے نہایت ہی قابل توجہ انقلابی بیانات امام علیہ السلام ارشادات
میں بہت ملتے ہیں جن کا ہم آگے چل کر انشاء اللہ ذکر کریں۔ اسی فہرست
میں حضرت کے اشعار بھی شامل ہیں جناب امام سجادؑ نے اشعار بھی کہے
ہیں اور ان اشعار کے مضامین بھی اسی قسم کے ہیں انشاء اللہ ہم آئندہ
اس سلسلہ میں بھی روشنی ڈالیں گے۔

درباری علماءؒ پر امام سجاد علیہ السلام کی سخت تنقید

امام زین العابدین علیہ السلام کے حالات اور طرز زندگی سے متعلق
مسائل کی تشریح کرتے ہوئے ہم اپنی بحث کے اس موڑ پر آپہنچے ہیں جہاں زمین
ایک ایسی عظیم اسلامی تحریک مہمیز کرنے کے لئے ہموار ہو چکی ہے جس کا
حکومت علوی و حکومت اسلامی پر منتہی ہونا ممکن نظر آنے لگا ہے اس صورتحال
کو بطور مختصر ہم یوں بیان کر سکتے ہیں کہ امام علیہ السلام کے طریقہ و روش میں
کچھ لوگوں کے لئے (معارف اسلامی کا) بیان و وضاحت کچھ لوگوں کے لئے
خود کو منظم و مرتب کرنے کی تلقین اور کچھ افراد وہ بھی تھے جن کیلئے عمل کی
راہیں معین و مشخص ہو جاتی تھیں۔ یعنی اب تک کے معروضات کی روشنی

میں امام سجادؑ کی تصویر کا جو خاکہ ابھر کر سامنے آتا ہے اس کے تحت حضرتؑ اپنے ۳۰۔۳۵ سال اس کوشش میں صرف کر دیتے ہیں کہ عالم اسلام کے شدت کے ساتھ برگشتہ ماحول کو ایک ایسی سمت کی طرف لے جائیں کہ خود آپؑ کے لئے موقع یا آپ کے جانشینوں کیلئے اس بنیادی ترین جدوجہد اور فعالیت کے لئے موقع فراہم ہو سکے جس کے تحت ایک اسلامی معاشرہ اور الٰہی حکومت قائم ہو سکے۔ چنانچہ اگر امام سجادؑ کی ۳۵ سالہ سعی و کوشش، ائمہ علیہم السلام کی زندگی سے جدا کر لی جائے تو ہرگز وہ صورتحال تصور نہیں کی جا سکتی جس کے نتیجے میں امام صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اولاً بنی امیہ اور پھر حکومت بنی عباس کے خلاف اتنی کھلی ہوئی واضح پالیسی اپنانے کا موقع ہاتھ آیا۔

ایک اسلامی معاشرہ وجود میں لانے کیلئے فکری و ذہنی طور پر زمین ہموار کرنا تمام چیزوں سے زیادہ لازم و ضروری ہے۔ اور یہ ذہنی و فکری آمادگی، اس وقت کے ماحول اور حالات میں، جس سے عالم اسلام دوچار تھا، وہ کام تھا جو یقیناً ایک طویل مدت کا طالب ہے اور یہی وہ کام ہے جو امام زین العابدین علیہ السلام نے تمام تر زحمت اور صعوبت و مصیبت کے باوجود اپنے ذمہ لیا تھا۔

اس عظیم ذمہ داری کے دوش بدوش امام سجادؑ کی زندگی میں

ایک اور تلاش و جستجو جلوہ گر نظر آتی ہے جو دراصل سابق کی تیار کردہ زمین کو مزید ہموار کرنے کی امامؑ کے ایک اور اقدام کی مظہر ہے۔ اس طرح کی کوششوں کا ایک بڑا حصہ سیاسی نوعیت کا حامل ہے اور بعض اوقات بے حد سخت مشکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس کا ایک نمونہ امام علیہ السلام کا حکومت وقت سے وابستہ اور ان کے کارگزار محدثوں پر کڑی تنقید ہے۔ موجودہ بحث میں اسی نکتہ پر روشنی ڈالنا مقصود ہے۔

ائمہ علیہم السلام کی زندگی سے متعلق ولولہ انگیز ترین بحثوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اسلامی معاشرہ کی فکر و ثقافت کو رنگ عطا کرنے والے افراد یعنی علماء[1]، و شعراء کے ساتھ ان بزرگواروں کا برتاؤ کیسا رہا ہے؟ اصل میں عوام کی فکری و ذہنی تربیت و رہبری ان ہی لوگوں کے ہاتھ میں تھی خلفائے بنی امیہ و بنی عباس معاشرہ کو جس رخ پر لے جانا پسند کرتے تھے یہ لوگ عوام کو اسی راہ پر لگا دیتے تھے گویا خلفاء کی اطاعت اور تسلیم کا ماحول پیدا کرنا ان ہی حضرات کا کام تھا۔ چنانچہ ایسے افراد کے ساتھ کیا روش اور طرز اپنایا جائے دیگر ائمہ علیہم السلام کی طرح امام سجادؑ کی زندگی کا بھی ایک بڑا ہی اہم اور قابل توجہ پہلو ہے۔

---

[1] یہاں علماء سے مراد اس زمانہ کے علمائے دین ہیں جن میں محدثین، مفسرین، قراء، قاضی صاحبان اور زاہد منش سب ہی شامل تھے۔

حدیث گڑھنا ظالموں کی ایک ضرورت :۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں خلفائے ظلم و جور کے سامنے ، اسلام کا عقیدہ رکھنے والوں پر اپنی حکومت قائم رکھنے کے لئے اس کے علاوہ کوئی دوسرا چارا ہی نہیں تھا کہ وہ جو کچھ بھی انجام دینا چاہتے ہیں اس کی طرف لوگوں کے قلبی ایمان کو جذب کریں کیوں کہ اس وقت زمانہ' صدر اسلام گزرے ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے تھے لوگوں کے دلوں میں اسلام کا عقیدہ و ایمان باقی تھا اگر لوگوں کو یقین پیدا ہو جاتا کہ یہ جو ظالم کی انہوں نے بیعت کی ہے درست نہیں ہے یا یہ خلیفہ' رسول اللہ کی خلافت کے لائق نہیں ہے یقیناً اپنے آپ کو ان کے حوالے نہ کرتے ۔ اور اگر یہ بات ہم سب کے لئے قبول نہ کریں تو بھی اسلامی معاشرے میں یقیناً ایسے افراد کثرت سے پائے جاتے تھے جو پورے ایمان قلبی کے ساتھ خلفاء کے دربار کی غیر اسلامی صورت حال کو تحمل کر رہے تھے یعنی ان کا خیال تھا کہ یہی اسلامی شان ہے ۔ یہی وجہ تھی کہ خلفائے جور نے اپنے دور کے زیادہ سے زیادہ دینی علماء اور محدثین کے خدمات سے استفادہ کیا اور ان لوگوں کو جو کچھ وہ چاہتے تھے اس کے لئے آمادہ کیا اور پھر ان سے کہا کہ ان کی مرضی کے مطابق خود پیغمبر اسلامؐ اور ان کے بزرگ اصحاب سے جعلی حدیثیں روایت کریں۔

حدیث گڑھنے کے کچھ نمونے :۔

اس سلسلہ میں مثالیں موجود ہیں جو انسان کو لرزا دیتی ہیں نمونہ کے طور پر ہم یہ حدیث نقل کرتے ہیں۔

معاویہ کے زمانہ میں ایک شخص کی کعب الاحبار[1] سے مڈبھیڑ ہو گئی، کعب الاحبار چونکہ معاویہ نیز دیگر شاہی امراء کے ساتھ اچھے تعلقات رکھتا تھا، اس لئے اس شخص سے سوال کیا۔ کہاں سے تعلق رکھتے ہو؟

۔ اہل شام سے ہوں۔

۔ شاید تم ان لشکریوں میں سے ہو جن کے سر ستّر ہزار افراد بغیر حساب کتاب کے وارد بہشت ہوں گے!!"

۔ وہ کون لوگ ہیں؟

۔ وہ سب اہل دمشق ہیں۔

۔ نہیں میں اہل دمشق نہیں ہوں۔

۔ پس تو شاید ان لشکریوں میں سے ہے کہ خدا جن کی طرف ہر روز دو بار نگاہِ (لطف) کرتا ہے (!!)

۔ وہ کون لوگ ہیں۔

---

[1] کعب الاحبار ایک یہودی تھا جو دوسرے دور خلافت میں مسلمان ہو گیا، اس کی بیان کردہ حدیثوں کے بارے میں بہت زیادہ شک و شبہ پایا جاتا ہے نہ صرف شیعوں کے درمیان بلکہ بہت سے اہل سنت حضرات بھی اس کی حدیثوں کے بارہ میں بدگمان رکھتے ہیں البتہ بعض اہل سنت نے اسکو قبول بھی کیا ہے۔

اہل فلسطین۔

اگر وہ آدمی کہدیتا: میں اہل فلسطین سے نہیں ہوں، تو شاید کعب الاحبار ایک ایک کر کے بعلبک، طرابلس اور شام کے بقیہ تمام شہروں کے ساکنین کے لئے حدیثیں نقل کرتا رہتا اور ثابت کر دیتا کہ یہ سب نہایت ہی صالح وشائستہ افراد ہیں! سب کے سب اہل بہشت ہیں!! کعب الاحبار یہ حدیثیں یا تو شامی امراء کی خوشامد اور چاپلوسی میں گڑھا کرتا تھا تاکہ وہ ان سے زیادہ سے زیادہ انعام ومدد حاصل کر کے ان کا محبوب ومقرب بن سکے یا یہ کہ اس کے اس عمل کی جڑیں اس کی اسلام دشمنی میں تلاش کرنی پڑیں گی جس کا مقصد احادیث اسلامی خلط ملط کر کے اقوال پیغمبر اسلامؐ کو مشتبہ اور ناقابل شناخت بنانا رہا ہوگا۔

تذکرہ اور رجال وحدیث کی کتابوں میں اس قسم کے بہت سے واقعات موجود ہیں۔ ان ہی میں سے ایک اس امیر کی داستان ہے جو اپنے فرزند کو ایک مکتب میں داخل کرتا ہے اور وہاں مہتمم مکتب اس کی پٹائی کر دیتا ہے، لڑکا روتا دھوتا گھر پہنچکر جب اپنے باپ کو اپنی پٹائی کی خبر دیتا ہے تو باپ غصہ میں بھرا ہوا کہتا ہے: ابھی جاتا ہوں اور کہتا ہوں کہ اس مہتمم کے خلاف ایک حدیث وضع کرو تاکہ مکتب کا مہتمم دوبارہ اس قسم کی غلطی کرنے کی جرأت نہ کرے!!

اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے لئے حدیث گڑھ لینا اس قدر آسان ہو چکا تھا کہ بچوں کی آنکھوں سے ڈھلنے والے آنسوؤں کے قطرے خود مہتمم مکتب یا اس کے وطن و شہر کے خلاف ایک حدیث ڈھالنے کے لئے کافی ہوتے تھے۔ بہر صورت یہی حالات اس کا سبب بنے کہ دنیائے اسلام میں ہی اسلام سے برگشتہ ایک خود ساختہ مخلوط و مجعول ذہنیت اور تہذیب و ثقافت پھلنے پھولنے لگی۔ اور اس غلط ذہنیت کو جنم دینے والے وہی علماء اور محدثین تھے۔ چنانچہ، ایسے سخت ترین حالات میں اس گروہ سے ٹکر لینا بہت ہی اہم اور فیصلہ کن ہے۔

محمد زہری کی چند جعلی حدیثیں:۔

اب ہم اس کا ایک نمونہ امام زین العابدین علیہ السلام کی زندگی سے نقل کرتے ہیں یہ نمونہ محمد بن شہاب[1] زہری کے ساتھ حضرت[ع] کے طرز عمل کی عکاسی کرتا ہے۔

محمد بن شہاب زہری شروع میں امام سجاد[ع] کے شاگردوں اور ساتھ اٹھنے بیٹھنے والوں میں نظر آتا ہے یعنی یہ وہ شخص ہے جس نے حضرت[ع] سے علوم حاصل کئے ہیں اور حضرت سے حدیثیں بھی نقل کی ہیں پھر بھی رفتہ رفتہ ـــــ اپنے اندر پائی جانے والی جسارت کے باعث ـــــ یہ شخص دربار خلافت سے قریب ہوتا گیا اور پھر ان درباری علماء محدثین

---

[1] بعض نے اس کا نام محمد بن مسلم زہری بھی نقل کیا ہے یعنی اس کے باپ کا نام کبھی ←

کے زمرے میں شامل ہو گیا جو ائمہ علیہم السلام کے بالمقابل کھڑے کئے گئے تھے۔

محمد بن شہاب زہری کی افتاد طبع سے مزید آشنائی پیدا کرنے کیلئے پہلے ہم اس کے بارہ میں چند حدیثیں نقل کرتے ہیں۔

ان میں سے ایک حدیث وہ ہے جس میں وہ خود کہتا ہے : کنا نکرہ کتابۃ العلم حتی اکرھنا علیہ ھؤلاء الامراء فرائینا ان لا یمنعہ احد من المسلمین[2] " ـــ شروع میں علمی قلم نگاری سے کام لینا ہمیں اچھا نہ لگتا تھا یہاں تک کہ امراء وحکام نے ہم کو اس بات پر آمادہ کیا کہ ہم جو کچھ جانتے ہیں قلمبند کر دیں تاکہ کتاب کی صورت میں آجائے۔ اس کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ کسی بھی مسلمان کو اس کام سے منع نہ کریں اور ہمیشہ علم و دانش سپرد قلم ہوتے رہیں۔

اس گفتگو سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت تک محدثین کے اس گروہ کے درمیان یہ دستور رواج نہیں پایا تھا کہ جو حدیثوں کو جانتے ہیں لکھ بھی ڈالیں۔ اسی طرح محمد بن شہاب زہری کا امراء کی خدمت میں ہونا اور ان کا اس کو اپنے علم دخواہش کے تحت حدیث قلمبند کرنے پر ابھارنا بھی اسی عبارت سے ثابت ہے۔

شہاب اور کبھی مسلم ملتا ہے شاید ایک اس کے باپ کا نام اور ایک اس کے باپ کا لقب رہا ہوگا۔
[2] طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۳۶ ـ ۱۳۵

ایک "معمر" نامی شخص کہتا ہے : "ہمارا خیال تھا کہ ہم نے زہری سے بہت زیادہ حدیثیں نقل کی ہیں یہاں تک کہ ولیدؒ مارا گیا، ولید کے قتل ہو جانے کے بعد ہم نے دیکھا کہ دفتروں کا ایک انبار ہے جو چوپایوں پر لاد کر ولید کے خزانے سے باہر کیا جا رہا ہے اور لوگ کہہ رہے ہیں کہ : یہ سب زہری کا علم ہےؒ" یعنی زہری نے ولید کی خواہش اور خوشامد میں اتنے دفاتر و کتب، حدیثوں سے پر کر دیئے تھے کہ جب ولید کے خزانے سے ان کو نکالنے کی نوبت آئی تو چوپایوں پر بار کرنے کی احتیاج محسوس ہوئی۔ یہ دفاتر و کتب جو ولید کے حکم سے ایک شخص کے ذریعے حدیثوں سے پر ہوئے ظاہر ہے ان میں کس طرح کی حدیثیں ہو سکتی ہیں ؟ بلاشبہ ان میں ایک حدیث بھی ولید کی مذمت اور اسے متنبہ کرنے والی نہیں مل سکتی بلکہ اس کے برخلاف یہ وہ حدیثیں ہیں جن کے ذریعہ ولید اور ولید جیسوں کے کرتوتوں پر مہر تصدیق ثبت کی گئی ہے۔

ایک دوسری حدیث زہری کے بارہ میں ہے جو بلاشبہ اس دور سے مربوط ہے جب زہری دربار خلافت سے وابستگی اختیار کر چکا تھا یعقوبی اپنی تاریخ میں لکھتا ہے :۔

" ان الزهری نسب الی رسول الله (ص) انه قال: لاتشد الرحال الا الی ثلاثه مساجد : المسجد الحرام ومسجد المدينة والمسجد الاقصیٰ وان الصخرة التی وضع

رسول اللہ قدمہ علیہا تقوم مقام الکعبۃ"[۳]

یعنی زہری نے رسول خدا صلعم کی طرف نسبت دی ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا ہے: صاحبان ایمان وتقدس سفر نہیں اختیار کرتے مگر یہ کہ تین مساجد — مسجد حرام، مسجد مدینہ اور مسجد اقصیٰ — کی طرف اور وہ پتھر جس پر، مسجد اقصیٰ میں، رسول خداؐ نے اپنا قدم (مبارک) رکھا تھا، اس "پتھر" کو کعبہ کی منزل حاصل ہے!!"

حدیث کا یہی آخری ٹکڑا میری توجہ کا مرکز ہے جس میں مسجد اقصیٰ کے ایک پتھر کو کعبہ کا مقام عطا کرتے ہوئے اس کے لئے اسی شرف واہمیت کا ذکر کیا گیا ہے جو کعبہ کو حاصل ہے۔!

یہ حدیث اس زمانے کی ہے جب عبداللہ بن زبیر کعبہ پر مسلط تھے۔ اور جب کبھی لوگوں کے دل میں حج (یا عمرہ) کے لئے جانے کی خواہش ہوتی وہ مجبور تھے کہ مکہ میں — ایک علاقہ جو عبداللہ ابن زبیر کے زیر نفوذ ہے — کچھ روز بسر کریں اور یہ عبداللہ ابن زبیر کے لئے اپنے دشمنوں کے خلاف، جن میں عبدالملک ابن مروان کا نام سر فہرست آتا ہے، پروپیگنڈہ کا سنہرا موقع ہوتا تھا چونکہ

---

[۱] ولید، عبدالملک بن مروان کا بڑا بیٹا ہے جو باپ کے مرنے کے بعد تخت خلافت پر قابض ہوا۔

[۲] فاذا الدفاتر قد حملت علی الدواب من خزائنہ ولیقال ھٰذا من علم الزہری۔

[۳] تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۸ نقل از کتاب "دراسات من الصحیح والکافی"

عبدالملک کی کوشش تھی کہ عوام ان پروپگنڈوں سے متاثر نہ ہونے پائیں لہٰذا وہ، ان کا مکہ جانا پسند نہ کرتا تھا چنانچہ اس نے اس کی بہترین اور آسان ترین راہ یہ دیکھی کہ ایک حدیث گڑھی جائے جس کے تحت مسجد اقصٰی کو شرف ومنزلت میں مکہ اور مدینہ کے برابر قرار دیدیا جائے حتّٰی کی وہ پتھر جو مسجد اقصٰی میں ہے کعبہ کے برابر شرف ومنزلت کا حامل ہو! حالانکہ ہم جانتے ہیں اسلامی ثقافت واصطلاح میں، دنیا کا کوئی خطہ کعبہ کی قدر و منزلت کو نہیں پہنچ سکتا اور دنیا کا کوئی پتھر خانۂ کعبہ کے پتھر — حجر اسود — کا مقام حاصل نہیں کر سکتا۔ اس اعتبار سے اس حدیث کے گڑھنے کی حاجت اسی لئے پڑی کہ عوام کو خانہ کعبہ نیز مدینہ منورہ کی طرف سامان سفر باندھنے سے منحرف کرکے فلسطین کی طرف جانے پر ابھارا جائے کیونکہ کعبہ کی طرح مدینہ بھی غالباً عبدالملک کے دربار کے خلاف پروپگنڈہ مہم کا مرکز رہا ہوگا۔ اسکے برخلاف فلسطین شام کا ہی ایک جزء تھا اور وہاں عبدالملک کو پورا تسلط اور نفوذ حاصل تھا۔ اب یہ جعلی حدیث عوام الناس پر کس حد تک اثر انداز ہوئی اس کو اوراق تاریخ میں تلاش کرنے کی ضرورت ہے کہ آیا کبھی ایسا اتفاق رونما ہوا کہ لوگ مکہ جانے کے بجائے بیت المقدس کی طرف "صخرہ" کی زیارت کے لئے گئے ہوں یا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا؟ بہر حال اگر کبھی اس طرح کا اتفاق ہوا بھی ہو تو اس کا اصل مجرم یا مجرمین میں سے

کس حد تک حضرت کے طرزعمل کا تعین کیا جا سکتا ہے پھر بھی اس حقیقت کے پیش نظر کہ اس خط کا لب ولہجہ خود زہری کے سلسلہ میں بھی اور اس طرح برسراقتدار حکومتی مشینری کے خلاف بھی بہت ہی سخت اور شدید ہے اور یہ خط محمد بن شہاب تک محدود نہیں رہتا، دوسرں کے ہاتھ میں بھی پڑتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ ایک زبان سے دوسری زبان اور ایک منہ سے دوسرے منہ تک ہوتے ہوئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دامن تاریخ پہ ثبت ہوکر تاریخ کا ایک جزو بن جاتا ہے اور آج تیرہ سو سال گزر جانے کے بعد بھی ہم اس خط کے بارے میں بحث کر رہے ہیں — ان امور پہ توجہ کرنے کے بعد — ہم بہ آسانی سمجھ سکتے ہیں کہ یہ خط زہری جیسے نام نہاد علماء، کے شیطانی تقدس پر کیسی کاری ضرب وارد کرتا یقیناً اس خط کا اصل مخاطب محمد بن شہاب زہری ہے لیکن یہ اپنی زد میں اس جیسے تمام ضمیر فروش افراد کو لئے ہوئے ہے۔ ظاہر ہے جس وقت یہ خط مسلمانوں، خصوصاً اس زمانے کے شیعوں کے ہاتھ آیا ہوگا اور ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں پہنچا ہوگا ان کے درمیان اس قسم کے درباری افراد کیلئے کیسی سخت بے اعتمادی پیدا ہوئی ہوگی۔

اب ہم اس خط کے کچھ حصے نقل کرتے ہیں :-

خط کی ابتداء، ان الفاظ میں ہوتی ہے : "کفانا اللہ وایاک

من الفتن و رحمك من النار" — خداوند عالم ہمیں اور تمہیں فتنوں سے محفوظ رکھے اور تم پر آتش جہنم سے رحم کرے۔ دوسرے فقرے میں صرف اس کو مورد خطاب قرار دیا ہے کیونکہ فتنوں سے دوچار ہونا سب کے لئے ہے اور ممکن ہے خود امام سجادؑ بھی کسی اعتبار سے فتنوں سے دوچار ہوں۔ لیکن فتنہ میں غرق ہونا امام سجادؑ کے لئے ناممکن ہے اس کے برخلاف زہری نہ صرف فتنہ سے دوچار بلکہ فتنہ میں غرق ہے۔ دوسری طرف آتش جہنم امام سجادؑ کے قریب نہیں آسکتی لہٰذا حضرتؑ اس کی نسبت محمد بن شہابؑ کی طرف دیتے ہیں۔ خط کا آغاز ہی ایسے لب ولہجہ میں کیا جانا جو نہ صرف مخالفانہ بلکہ تحقیر آمیز بھی ہو زہری کے تئیں حضرت کے طرز عمل کی خود دلیل ہے۔

اس کے بعد فرماتے ہیں: فقد اصبحت بحال ینبغی لمن عرفك بها ان یرحمك تم اس منزل پر کھڑے ہو کہ جو شخص بھی تمہاری حالت کو سمجھ لیں وہ تمہارے حال زار پر رحم کرے — غور فرمائیے کہ یہ کس شخصیت سے خطاب ہے؟

یہ ایک ایسے شخص سے خطاب ہے جس پر لوگ غبطہ کرتے ہیں، جس کا دربار حکومت میں بزرگ علمائے دین میں شمار ہوتا ہے۔ پھر بھی امام علیہ السلام اس کو اس قدر حقیر و ناتواں خیال کرتے ہوئے

فرماتے ہیں: تو اس قابل ہے کہ جو لوگ تجھے اس حال میں دیکھیں، تیرے حال پر رحم کریں۔

اس کے بعد اس کو مختلف الٰہی نعمتوں سے نوازے جانے اور خدا کی جانب سے ہر طرح حجتیں تمام ہو جانے کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے امام کہتے ہیں: "ان تمام نعمتوں کے باوجود، جو تجھے خدا کی جانب سے ملی ہیں کیا تو خدا کے حضور کہہ سکتا ہے کہ کسی طرح تو نے ان نعمتوں کا شکر ادا کیا؟ یا نہیں۔" پھر قرآن کی چند آیتوں کا ذکر کرتے ہیں اور فرماتے ہیں: خداوند کریم نے علماء پر فرض کیا ہے کہ وہ حقائق کو عوام الناس کے سامنے بیان کریں اور کتمان حق سے کام نہ لیں: "لتبیننه للناس ولا تکتمونه"

اس تمہید کے بعد جس وقت امام خط کے اصل مطلب پر آتے ہیں تو محمد بن شہاب کے حق میں خط کا انداز اور بھی سخت ہو جاتا ہے:۔

"واعلم ان ادنی ماکتمت واخف ما احتملت ان انست وحشه الظالم وسهلت له طریق الغی بدنوک منه حین دنوت واجابتك له حین دعیت۔"

یاد رکھ! وہ معمولی ترین چیز جس کے سلسلہ میں تو نے کتمان سے کام لیا ہے اور وہ سبک ترین بات جو تو نے برداشت کی ہے یہ ہے ظالموں کے لئے، جو چیز وحشت ناک تھی اس کو تو نے

راحت و انسیت کا سامان بنا کر ان کے لئے گمراہی کے راستے مزید ہموار کر دیئے۔ اور یہ کام تو نے محض ان کا تقرب حاصل ہو جانے کے لئے کیا چنانچہ انھوں نے تجھکو جب بھی (کسی امر کی) دعوت دی تو تیار ہو گیا۔ یہاں حضرت اس کی دربار حکومت و خلافت کے ساتھ قربت و وابستگی کو اس طرح اس کے سامنے پیش کرتے ہیں گویا سر پہ تازیانہ مار رہے ہوں۔

"..... انك اخذت ماليس لك ممّن اعطاك"

ان لوگوں سے جو کچھ تجھکو حاصل ہوا وہ تیرا حق نہ تھا پھر بھی تو نے لے لیا۔

"ودنوت ممن لم يرد على احد حقا ولم ترد باطلا حين ادناك"

اور تو ایک ایسے شخص کے قریب ہو گیا جس نے کسی کا کوئی حق واپس نہ کیا (یعنی خلیفہ ستمگر) اور جب اس نے تجھ کو اپنی قربت میں جگہ دی تو تو نے ایک بھی باطل اس سے دور نہ کیا، یعنی تو بہانہ نہیں بنا سکتا کہ میں اس لئے قریب ہوا تھا کہ احقاق حق اور ابطال باطل کر سکوں کیونکہ تو جس وقت سے اسکے ساتھ ہے کسی بھی امر باطل کا خاتمہ نہ کر سکا جبکہ اس کا دربار سراسر باطل سے معمور ہے۔

" واجبت من عاد الله " تو نے دشمن خدا کو اپنی دوستی کیلئے منتخب کر لیا۔ اس تہدید نامہ میں امامؑ کا وہ جملہ جو ذہن کو سب سے زیادہ

جھنجھوڑتا ہے یہ ہے کہ امام فرماتے ہیں :-

اولیس بدعائہ ایاك ـــ حین دعاك ـــ جعلوك قطبًا اداروا بك رحی مظالمھم وجسرا یعبرون علیه الا بلا یاھم وسلما الیٰ ضلالتھم داعیا الیٰ غیّھم، سالکا سبیلھم ، یدخلون بك الشك علی العلماء ویقتادون بك قلوب الجھال الیھم "

آیا ایسا نہیں ہے اور تو نہیں جانتا کہ انھوں نے جب تجھ کو خود سے قریب کر لیا تو تیرے وجود کو ایک ایسا قطب اور محور بنا دیا جس کے گرد مظالم کی چکی گردش کرتی رہے اور تجھ کو ایک ایسا پل قرار دیدیا جس سے ان کی تمام غلط کاریوں کے کاروان عبور کرتے رہتے ہیں۔ انھوں نے ایک ایسی سیڑھی تعمیر کر لی ہے جو انھیں ان کی ذلت و گمراہی تک پہونچنے میں سہارا دیتی ہے تو ان کی گمراہیوں کی طرف دعوت دینے والا اور ان ہی کی راہ پر چلنے والا بن گیا انھوں نے تیرے ذریعہ علماء میں شک و شبہ کی جگہ پیدا کر دی اور جاہلوں کے قلوب اپنی جانب جذب کر لئے۔ یعنی تو علماء کے اندر یہ شک و شبہ پیدا کرنے کا سبب بنا کہ "کیا حرج ہے کہ ہم بھی دربار حکومت سے وابستہ ہو جائیں ؟ بلکہ بعض اس دھوکے میں آ بھی گئے ۔ (اس کے علاوہ) تو اس بات

کا بھی سبب بنا کہ جہلاء بڑے اطمینان کے ساتھ خلفاء کی طرف مائل اور ان میں جذب ہو گئے۔

اس کے بعد حضرت فرماتے ہیں:۔

فلم یبلغ اخص وزرائھم ولا اقوی اعوانھم الادون مابلغت من اصلاح فسادھم......"

ان کے نزدیک ترین وزراء اور زبردست ترین احباب بھی ان کی اس طرح مدد نہ کر سکے جس طرح تو نے ان کی برائیوں کو عوام کی نظروں میں اچھا بنا کر پیش کر کے مدد کی ہے۔

یہ خط لب ولہجہ کے اعتبار سے نہایت ہی سخت اور مضامین کے لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ امام زین العابدین علیہ السلام نے اس خط کے ذریعہ سیاسی قدرت واقتدار اور اجتماعی زمام واختیار کے زیر سایہ پروان چڑھنے والی علمی وفکری اقتدار اور زمامداری کی لہر کو ذلیل ورسوا کر دیا اور وہ لوگ جو دربار کے ساتھ روابط استوار کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے ان کی نیندیں اڑ گئیں وہ معاشرہ میں ایک سوال بن کر رہ گئے ایک ایسا سوال جو ہمیشہ کے لئے اسلامی در و دیوار پہ ثبت ہو کر رہ گیا اس وقت کا معاشرہ بھی اس سوال سے دوچار تھا اور تاریخ ہر دور میں یہ سوال اپنی جگہ برقرار رہے گا۔

میری نظر میں، یہ امام سجادؑ کی زندگی کا ایک اہم پہلو ہے اور مجھے محسوس ہوتا ہے کہ حضرتؑ نے اپنی جد وجہد محض ایک محدود طبقہ میں علمی و تربیتی تحریک پیدا کرنے تک محدود نہیں رکھی بلکہ سیاسی تحریک تک میں اس پیمانے پر حصہ لیتے رہے ہیں

امام زین العابدین علیہ السلام کی زندگی کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ آیا یہ عظیم ہستی ارباب خلافت اور ان کی مشینری سے معترض ہوئی ہے یا نہیں؟

گزشتہ مباحث میں اس موضوع پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی جا چکی ہے یہاں ذرا تفصیل اور وضاحت کے ساتھ ہم اس پہلو کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔

ائمہ علیہم السلام کی تحریک کے تیسرے مرحلہ کے آغاز کی حکمت عملی۔

جہاں تک امام سجادؑ کی زندگی کا میں نے مطالعہ کیا ہے اور اور میری یادداشت کا سوال ہے مجھے حضرت کی زندگی میں کوئی ایک موقع بھی ایسا نہ مل سکا جہاں حکومت سے آپ نے اس طرح سے صریحی طور پر تعرض کیا ہو جیسا کہ دیگر ائمہ علیہم السلام مثلاً بنی امیہ کے دور میں امام صادق علیہ السلام یا بعد میں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے یہاں نظر آتا ہے۔ اور اس کی وجہ بھی ظاہر ہے کیونکہ ائمہ کی امامت اور سیاسی

تحریک کے چار ادوار جس کے تیسرے مرحلہ کا آغاز امام زین العابدین علیہ السلام کی زندگی سے ہوتا ہے اگر اسی مرحلہ میں خلافت سے تعرض کی تحریک شروع کر دی جاتی تو پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ خطروں سے معمور ذمہ داریوں کا یہ کارواں، اہلبیت علیہم السلام جس منزل تک لے جانا چاہتے تھے نہیں پہنچ سکتا تھا۔ وہ گلستان اہلبیت جس کی تربیت و آبیاری امام سجادؑ جیسے ماہرانہ صلاحیت کا حامل باغباں کر رہا تھا، ابھی اتنا زیادہ مستحکم اور پائیدار نہیں ہو سکا تھا۔ اس باغ میں ایسے نورس نونہال بھی موجود تھے جن میں طوفانی جھکڑوں سے مقابلہ کرنے کی طاقت، ابھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ جیسا کہ ہم اس بحث کے آغاز میں اشارہ کر چکے ہیں، امام علیہ السلام کے گرد و پیش، اہلبیتؑ سے محبت و عقیدت رکھنے والے مومنین کی بہت ہی مختصر سی تعداد تھی اور اس زمانے میں ممکن نہیں تھا کہ اس قلیل تعداد کو، جس کے کاندھوں پر شیعی تنظیم کو چلانے کی عظیم ذمہ داری بھی ہے، ظالم تھپیڑوں کے حوالے کر کے ان کو موت کے گھاٹ اتر جانے پر مجبور کر دیں۔

اگر تشبیہ دینا چاہیں تو امام زین العابدینؑ کے دور کی مکہ میں پیغمبر اسلام کی دعوت کے ابتدائی دور سے تشبیہہ دی جا سکتی ہے۔ یعنی دعوت اسلام کے وہ چند ابتدائی سال جب علی الاعلان

دعوت دینا بھی ممکن نہ تھا۔ اسی طرح شاید امام محمد باقر علیہ السلام کے دور کی پیغمبرؐ کی مکی تبلیغ کے دوسرے دور سے اور پھر اس کے ادوار کی دعوت اسلام کے بعد کے ادوار سے تشبیہ غلط نہ ہوگی۔ لہٰذا تعرض اور مڈبھیڑ کی حکمت عملی، جو امام صادق، امام کاظم اور امام رضا علیہم السلام کے بعض کلمات سے مترشح ہوتی ہے، امام سجادؑ بھی اپنا لیتے تو عبدالملک بن مروان، جس کا اقتدار پورے اوج پر نظر آتا ہے، بڑی آسانی کے ساتھ تعلیمات اہلبیت کی پوری بساط الٹ کر رکھ دیتا اور پھر کام ایک نئے سرے سے شروع کرنا پڑ جاتا اور یہ اقدام عاقلانہ نہ ہوتا۔

اس کے باوجود، امام زین العابدین علیہ السلام کے ارشادات واقوال میں، جو غالباً آپ کی زندگی اور طویل دور امامت کے آخری دنوں سے مربوط ہیں، کہیں کہیں حکومتی مشینری کے ساتھ تعرض ومخالفت کے اشارے بھی مل جاتے ہیں۔[1]

ائمہ کی طرف سے مزاحمت کے چند نمونے:

ائمہ علیہم السلام کی تعرض آمیز روش کے جلوے مختلف شکلوں

---

[1] یہاں اشارہ کر دوں کہ اس وقت میری بحث یزید اور خاندان ابوسفیان کی خلافت کے ساتھ امام کے طرز عمل سے نہیں ہے یہ ایک مستقل موضوع ہے جس پر پہلے ہی روشنی ڈال چکا ہوں۔

میں ظاہر ہوئے ہیں جن میں سے ایک شکل تو وہی تھی جو محمد بن شہاب زہری کے نام امام زین العابدین علیہ السلام کے خط میں آپ نے ملاحظہ فرمائی، ایک شکل معمولی دینی مسائل اور اسلامی تعلیمات کے پردے میں اموی خلفاء کی وضع و سرشت اور حقیقت و بنیاد پر روشنی ڈال دینے کی تھی چنانچہ ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں :۔

" ان بنی امیۃ اطلقوا للناس تعلیم الایمان ولم یطلقوا تعلیم الشرک لکی اذا حملوھم علیہ لم یعرفوہ "

یعنی بنی امیہ نے لوگوں کے لئے تعلیمات ایمانی کی راہیں کھلی چھوڑ رکھی تھیں، لیکن حقیقت شرک سمجھنے کی راہیں بند کر دی ہیں کیونکہ اگر عوام (مفہوم) شرک سے نابلد رہے تو شرک (کی حقیقت) نہ سمجھ سکیں گے۔

مطلب یہ ہے کہ بنی امیہ نے علماء اور متدین افراد، منجملہ ان کے ائمہ علیہم السلام، کو نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ نیز دیگر عبادات اور .... اسی طرح توحید و نبوت سے متعلق بحث و گفتگو کرنے کی چھوٹ دے رکھی تھی کہ وہ ان موارد میں احکام الٰہی بیان کریں لیکن ان کو اس بات

ائمۃ الجور"

یہ شرک کی تعبیر، ان قوموں پر بھی صادق آتی ہے جنھوں نے ائمۂ حق کی اطاعت سے انکار کرتے ہوئے ائمۂ جور سے الحاق اور پیروی اختیار کرلی۔

"لعدولھم عن الأدلۃ العقلیہ والنقلیہ واتباعھم الاھواء وعدولھم عن النصوص الجلیۃ"

کیونکہ ان لوگوں نے ان عقلی ونقلی دلائل سے (جو، مثال کے طور پر عبدالملک کی، مسلمانوں پر حکومت وخلافت کی نفی کرتی ہے) عدول اختیار کرلیا اور اپنی ہوا وہوس کی پیروی شروع کردی۔ روشن و واضح نصوص کو ٹھکرا دیا۔ لوگوں نے دیکھا حکام وقت سے ٹکر لینے کی نسبت یہ زندگی آرام دہ بھی ہے۔ اور ہر طرح کے درد سری سے خالی بھی، لہٰذا اسی راحت طلبی میں لگ گئے اور ائمۂ جور کی پیروی اختیار کرلی۔ لہٰذا وہ بھی مشرک قرار پاتے ہیں۔

ان حالات میں، اگر ائمہ علیہم السلام شرک کے بارے میں کچھ بیان کرنا چاہیں تو یہ دربار خلافت سے ایک طرح کا تعرض ہوگا اور یہ چیز امام زین العابدین علیہ السلام کی زندگی اور حضرت کے کلمات میں موجود ہے۔

اس تعرض و مخالفت کا ایک اور نمونہ ہم امام علیہ السلام اور جابر و قدرت مند اموی حاکم ـــ عبدالملک کے درمیان ہونے والی بعض خط وکتابت میں مشاہدہ کرتے ہیں جس کے دو روشن نمونوں کی طرف یہاں اشارہ مقصود ہے۔

۱۔ ایک دفعہ عبدالملک بن مروان نے امام سجادؑ کو خط لکھا اور اس میں حضرت کو اپنی ہی آزاد کردہ کنیز کے ساتھ ازدواج کر لینے سلسلہ میں مورد ملامت قرار دیا۔ اصل میں حضرت کے پاس ایک کنیز تھی جس کو آپ نے پہلے آزاد کر دیا اس کے بعد اسی آزاد شدہ کنیز سے نکاح کر لیا۔ عبدالملک نے خط لکھ کر امامؑ کے اس عمل کو مورد شماتت قرار دیا۔ ظاہر ہے امامؑ کا عمل نہ صرف انسانی بلکہ ہر اعتبار سے اسلامی تھا کیونکہ ایک کنیز کو کنیزی اور غلامی کی زنجیر سے آزادی دینا اور پھر عزت و شرافت کا تاج پہنا کر اسی کنیز کو رشتۂ ازدواج سے منسلک کر لینا یقیناً انسانیت کا اعلیٰ شاہکار ہے۔ اگرچہ عبدالملک کے خط لکھنے کا مقصد کچھ اور ہی تھا، وہ امامؑ کے اس مستحسن عمل کو تنقید کا نشانہ بنا کر حضرت کو یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ ہم آپ کے داخلی مسائل سے بھی آگاہی رکھتے ہیں گویا اس کے ضمن میں اصل مقصد حضرت کو ذاتی سرگرمیوں کے سلسلہ میں متنبہ کرنا تھا ـــ امام سجادؑ جواب میں ایک خط تحریر فرماتے ہیں جس

میں مقدمہ کے طور پر لکھتے ہیں :-

یہ عمل کسی طرح بھی قابل اعتراض نہیں قرار دیا جا سکتا بزرگوں نے بھی اس طرح کا عمل انجام دیا ہے حتی کہ پیغمبر اسلام ص کے یہاں بھی اسی طرح کا عمل ملتا ہے چنانچہ اس سلسلہ میں میرے لئے کوئی ملامت نہیں ہے :-

فلا لؤم علیٰ امری : مسلم انما اللؤم لؤم الجاهلیة

یعنی ایک مسلمان کیلئے کسی طرح کی ذلت و خواری نہیں پائی جاتی ہاں ذلت و پستی تو وہی جہالت کی ذلت و پستی ہے۔ عبدالملک کے لئے اس جملہ میں بڑا ہی لطیف طنز اور نصیحت مضمر ہے کتنے حسین انداز میں اسے اس کے آباء و اجداد کی حقیقت کی طرف متوجہ کر دیا گیا ہے کہ یہ تم ہو جس کا خاندان جاہل و مشرک اور دشمن خدا رہا ہے اور جن کے صفات تم کو وراثت میں حاصل ہوئے ہیں !! اگر شرم ہی کی بات ہے تو تم کو اپنی حقیقت پر شرم کرنی چاہیئے میں نے تو ایک مسلمان عورت سے شادی کی ہے اس میں شرم کی کیا بات ہے۔ ؟

جس وقت یہ خط عبدالملک کے پاس پہنچا، سلیمان، عبدالملک کا دوسرا بیٹا، باپ کے پاس موجود تھا، خط پڑھا گیا تو اس نے بھی سنا اور امام ع کی طنز آمیز نصیحت کو باپ کی طرح اس نے بھی محسوس کیا۔

وہ باپ سے مخاطب ہوا : اے امیرالمومنین ، دیکھا ،علی ابن الحسینؑ
نے آپ پر کس طرح مفاخرت کا اظہار کیا ہے ؟ وہ اس خط میں آپ کو
سمجھانا چاہتے ہیں کہ ہمارے باپ دادا تو تمام مومن باللہ رہے ہیں
اور تیرے باپ دادا کافر و مشرک رہے ہیں" وہ باپ کو بھڑکانا چاہتا تھا
تاکہ اس خط کے سلسلہ میں عبدالملک کوئی سخت اقدام کرے لیکن
عبدالملک بیٹے سے زیادہ سمجھدار تھا۔ وہ جانتا تھا اس نازک مسئلہ میں
امام سجادؑ سے الجھنا درست نہیں ہے لہذا اس نے بیٹے کو سمجھاتے ہوئے
کہا : میرے بیٹے ! کچھ نہ کہو ، تم نہیں جانتے یہ بنی ہاشم کی زبان
ہے جو پتھروں میں شگاف پیدا کر دیتی ہے : یعنی ان کا استدلال
ہمیشہ قوی اور لہجہ سخت ہوتا ہے ۔

دوسرا نمونہ :۔ امام علیہ السلام کا ایک دوسرا خط ہے جو
عبدالملک کی ایک فرمائش رد کرنے کی بنا پر عبدالملک کی جانب
سے تہدید و فہمائش کے جواب میں آپ نے فرمایا ہے ۔ واقعہ
کچھ یوں پیش آتا ہے ۔

عبدالملک کو معلوم ہوا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی
تلوار امام سجادؑ کی تحویل میں ہے اور یہ ایک قابل توجہ چیز تھی کیونکہ وہ
نبی کی یادگار اور فخر کا ذریعہ تھی ، اور اب اس کا امام سجادؑ کی تحویل میں

چھوڑ دینا عبدالملک کے لئے خطرناک تھا کیونکہ وہ لوگوں کو اپنی طرف کھینچتی تھی۔ لہٰذا اس نے جو خط امام سجادؑ کو لکھا اس میں درخواست کی کہ حضرت تلوار اس کے لئے بھیج دیں اور ذیل میں یہ بھی تحریر کر دیا تھا کہ اگر آپ کو کوئی کام ہو تو میں حاضر ہوں آپ کا کام ہو جائیگا مطلب یہ تھا آپ کے اس ہبہ کا عوض میں دینے کو تیار ہوں۔

امام علیہ السلام کا جواب انکار میں تھا لہٰذا دوبارہ اس نے ایک تہدید آمیز خط لکھا کہ اگر تلوار نہ بھیجی تو میں بیت المال سے آپکا وظیفہ بند کر دوں گا[1] امام اس دھمکی کا جواب تحریر فرماتے ہیں:

"امابعد خداوند عالم نے ذمہ داری لی ہے کہ وہ اپنے پرہیزگار بندوں کو جو چیز انھیں ناگوار ہے اس سے نجات عطا کرے گا اور جہاں سے وہ سوچ بھی نہ سکے ایسی جگہ سے روزی بخشے گا اور قرآن میں ارشاد فرما دیا ہے:

"ان اللّٰہ لا یحب کل خوّان کفور"

یقیناً خدا کسی ناشکرے خیانت کار کو دوست نہیں رکھتا۔

اب دیکھو ہم دونوں میں سے کس پر یہ آیت منطبق ہوتی ہے۔"

---

[1] یہ وہ زمانہ تھا جب تمام لوگوں کو بیت المال سے وظیفہ ملتا تھا اور امام علیہ السلام بھی تمام افراد کی طرح معین وظیفہ لیتے تھے۔

ایک خلیفۂ وقت کے مقابلہ میں یہ لہجہ بہت سخت تھا، کیونکہ یہ خط جس کسی کے ہاتھ بھی لگا وہ خود فیصلہ کرے گا کہ امامؑ اولاً : خود کو خائن اور ناشکرا نہیں سمجھتے، ثانیاً : کوئی دوسرا شخص بھی اس عظیم ہستی کے بارے میں ایسا رکیک تصور نہیں رکھتا، کیونکہ حضرت کا خاندان نبوت کے منتخب اور شائستہ ترین عظیم شخصیتوں میں شمار ہوتا تھا اور ہرگز اس آیت کے مستحق نہیں قرار دیئے جا سکتے تھے۔ چنانچہ امام سجادؑ کی نظر میں عبدالملک خائن اور ناشکرا ہے۔

دیکھئے! کس شدید انداز میں امام سجادؑ عبدالملک کی دھمکی کا جواب دیتے ہیں اس سے حضرت کے فیصلہ کن عمل کی حدود کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ___ بہر حال یہ اموی سرکار کی نسبت امام کے مزاحمت آمیز طرز عمل کے دو روشن نمونے تھے۔

۳) اگر اس میں کسی دوسرے نمونے کا اور اضافہ کرنا چاہیں تو یہاں وہ اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں جو خود امام زین العابدین علیہ السلام سے یا آپ کے دوستوں سے نقل ہوئے ہیں۔ یہ بھی اپنی مخالفت کے اظہار کا ایک انداز ہے کیونکہ، اگر ہم یہ مان کر چلیں، کہ خود حضرت نے کوئی اعتراض نہیں کیا تو بھی آپ کے قریبی افراد معترض رہے ہیں اور یہ خود ایک طرح سے امام کی مزاحمت میں شمار کیا جائے گا۔

سے ہشام کی اہانت میں شمار ہوتی۔

مشہور شاعر، فرزدق، جو اہلبیت سے خلوص و محبت رکھتا تھا، وہیں موجود تھا، اس نے جب محسوس کیا کہ لوگ تجاہل سے کام لے رہے ہیں اور یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ ہم علی ابن الحسین علیہ السلام کو نہیں جانتے ہیں آگے بڑھا اور آواز دی: اے امیر! اگر اجازت دیں تو میں اس شخص کا تعارف کرادوں؟ ہشام نے کہا: ہاں ہاں بتاؤ کون ہے؟ اس وقت فرزدق نے وہیں ایک برجستہ قصیدہ پڑھنا شروع کردیا جو شعرائے اہلبیتؑ کے معروف ترین قصیدوں میں سے ہے اور شروع سے آخر تک امام زین العابدین علیہ السلام کی شاندار مدح سے معمور ہے مطلع یوں شروع ہوتا ہے۔

"هذا الذی تعرف البطحاء وطأته ؛ والبیت یعرفه والحلّ والحرام"

اگر تم اس کو نہیں پہچانتے (تو نہ پہچانو) یہ وہ ہے کہ سرزمین بطحا اس کے قدموں کے نشان پہچانتی ہے یہ وہ شخص ہے کہ حل و حرم اس کو پہچانتے۔

اور پھر یہ وہ ہے، زمزم و صفا جس کو پہچانتے ہیں ..... یہ پیغمبر اسلامؐ کا فرزند ہے ...... یہ بہترین انسان کا فرزند ہے ..... مدح کی موتی لٹانے پر آیا تو ایک قصیدۂ غرا میں اس امام سجادؑ کے خصوصیات کا ذکر کرنا شروع کردیا کہ ہر ہر مصرع ہشام کے سینے میں خنجر کی طرح چبھتا

چلا گیا ـــــ اور اس کے بعد ہشام کے غضب کا نشانہ بھی بننا پڑا، ہشام نے بزم سے نکال باہر کیا لیکن امام سجادؑ نے اس کے لئے انعام کی تھیلی روانہ کی، جس کو فرزدق نے اس معذرت کے ساتھ واپس کر دیا کہ: میں نے یہ اشعار خدا کی خوشنودی کے لئے کہے ہیں، آپ سے پیسہ لینا نہیں چاہتا۔
اس طرح کے انداز مزاحمت، امام کے اصحاب کے یہاں مشاہدہ کئے جا سکتے ہیں جس کا ایک اور نمونہ یحییٰ بن ام الطویل کا طرز عمل ہے۔ البتہ یہ ذکر شعر و شاعری کے ضمن میں نہیں آتا۔

یحییٰ بن ام الطویل اہل بیت سے وابستہ نہایت ہی مخلص اور شجاع جوانوں میں سے ہے جس کا معمول یہ ہے کہ وہ کوفہ جاتا ہے لوگوں کو جمع کرتا ہے اور آواز دیتا ہے: اے لوگو (مخاطب حکومت بنی امیہ کے آگے پیچھے بھاگنے والے افراد ہیں) ہم تمہارے (اور تمہارے آقاؤں کے) منکر ہیں جب تک تم لوگ خدا پر ایمان نہیں لاتے، ہم تم کو قبول نہیں کرتے۔" اس گفتگو سے ایسا لگتا ہے کہ وہ لوگوں کو مشرک سمجھتا ہے اور ان کو کافر و مشرک کے الفاظ سے خطاب کرتا ہے۔

بنی امیہ سرکار کا امام سجادؑ کے ساتھ تعرض:

یہ امام زین العابدین علیہ السلام کی زندگی کا ایک مختصر سا خاکہ ہے البتہ یہاں پھر اشارہ کر دوں کہ امامؑ اپنے ۳۴ برس کے طویل

دور امامت میں، ارباب حکومت کے ساتھ کھل کر کبھی کوئی تعرض اور مخالفت نہ کی پھر بھی اپنی امامت کے اس عظیم دستر خوان کو وسیع سے وسیع تر کرتے رہے اور تعلیم و تربیت کی ایمانی غذاؤں سے بہت سے مومن و مخلص افراد پیدا کئے دعوت اہلبیت کو وسعت حاصل ہوتی رہی اور یہی وہ چیز تھی جس کی وجہ سے اموی سرکار حضرت کے سلسلہ میں بدبین و فکر مند رہنے لگی یہاں تک کہ حضرت کی راہ میں رکاوٹ اور روک ٹوک بھی کی گئی اور کم از کم ایک مرتبہ حضرت کو طوق و زنجیر میں کس کر مدینہ سے شام بھی لے جایا گیا۔ حادثۂ کربلا میں امام زین العابدین علیہ السلام کا طوق و زنجیر میں جکڑ کر شام لے جایا جانا مشہور ہے لیکن کربلا کی اسیری میں اگر حضرت کا گلوئے مبارک نہ بھی جکڑا گیا ہو تو بھی اس موقع پر یہ بات یقینی ہے یعنی حضرت کو مدینہ سے اونٹ پر سوار کیا گیا اور طوق و زنجیر میں جکڑ کر شام لے جایا گیا۔ اس کے علاوہ بھی کئی دوسرے موارد پیش آئے جب آپ کو مخالفین کی طرف سے آزار و شکنجے کا سامنا کرنا پڑا اور آخر کار ولید بن عبد الملک کے دور خلافت ۹۵ھ میں خلافت بنی امیہ کے سرکاری کارگزاروں کے ہاتھوں زہر دیکر شہید کر دیا گیا۔

فارسی متن: "پاسدار اسلام"

ولی امر مسلمین
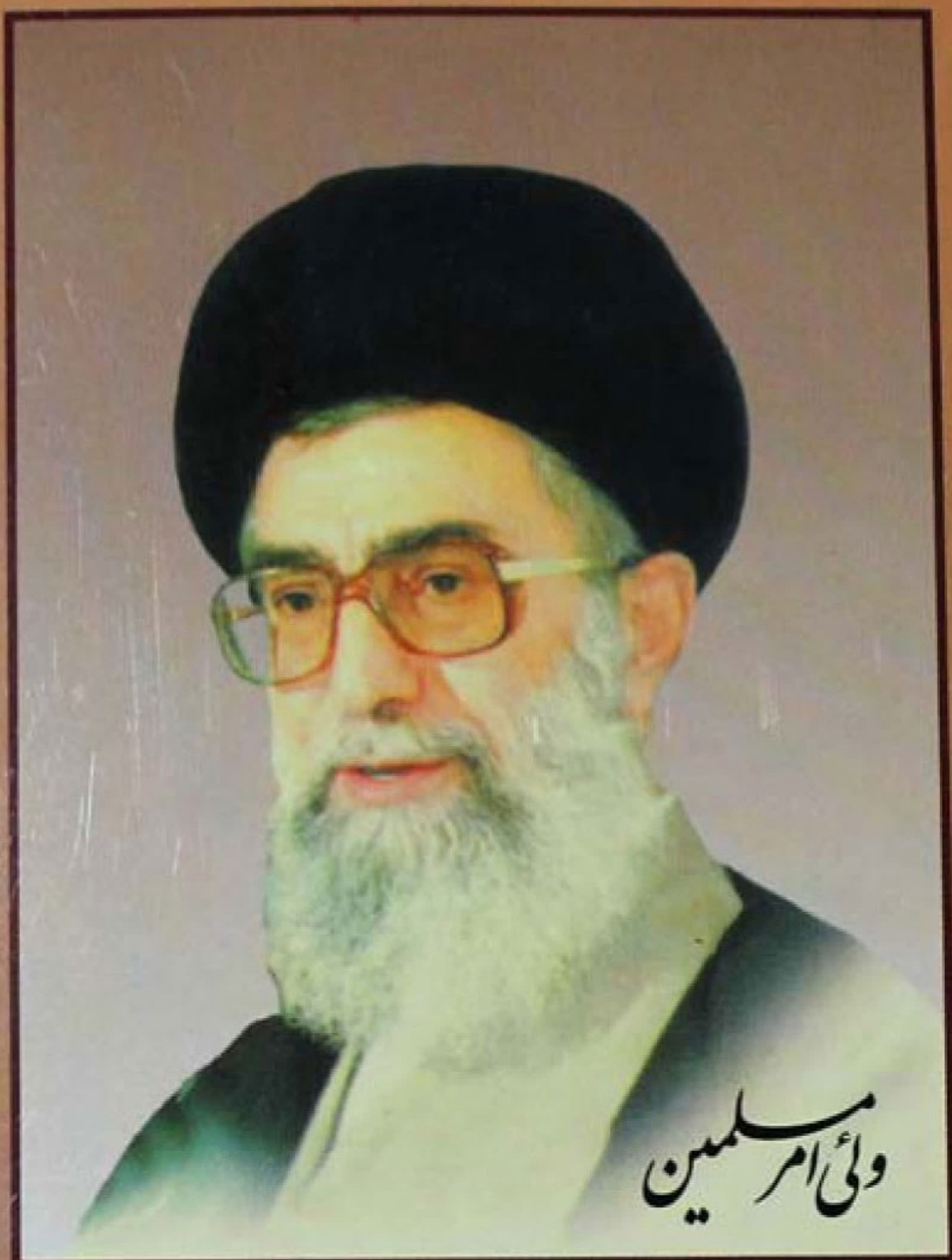
آیۃ اللہ العظمیٰ آقائی سید علی خامنہ ای مدظلہ الشریف

NOOR-E-HIDAYAT FOUNDATION
Imambara Ghufran Maab
LUCKNOW-3 (U.P.) INDIA
Phone : 2252230